انتخابِ نثر و نظم

INTIKHAB-E-
NASR-O-NAZM

برائے گیارہویں جماعت

FOR CLASS XI

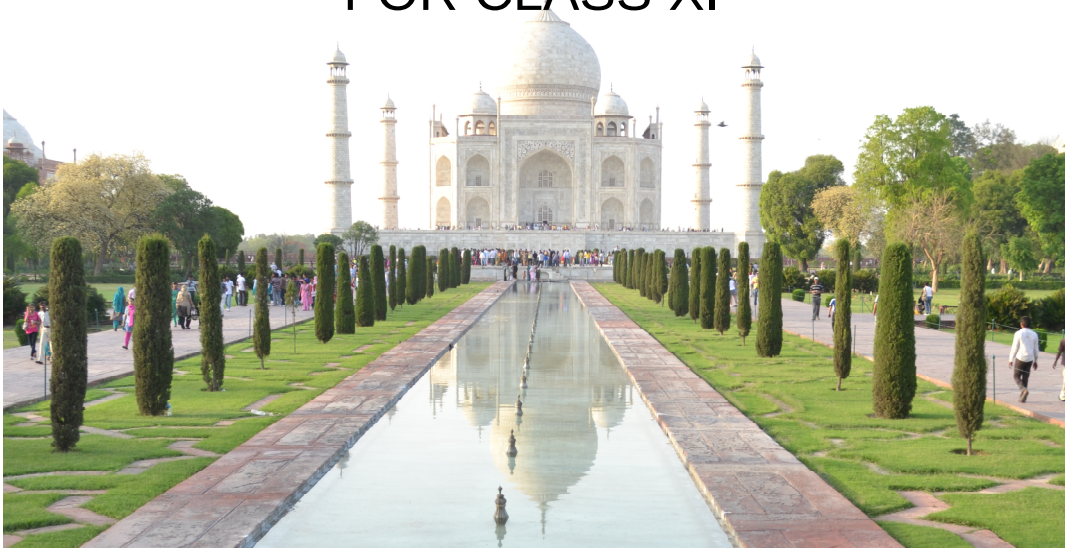

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر
ek/;fed f'k{kk ckM] jkt LFkku] vtej

انتخابِ نثر و نظم

INTIKHAB-E-NASR-O-NAZM

برائے گیارہویں جماعت

FOR CLASS XI

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر
ek/;fed f'k{kk ckM] jkt LFkku] vtej

انتخابِ نثر و نظم

INTIKHAB-E-NASR-O-NAZM

برائے گیارہویں جماعت

FOR CLASS XI

مرتّبین

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ (کنوینر)

Dr. Moinuddin 'Shaheen'
(Convener)
P.G. Deptt. of Urdu
Govt. Dungar College, Bikaner

ڈاکٹر شاہدالحق چشتی

Dr. Shahidul Haque Chishty
(Principal)
Govt. Adarsh Higher Secondary School
Gagwana (Ajmer)

شاہد اختر خان

Shahid Akhtar Khan
Principal (Retired)
Deptt., of Education Rajasthan

محمد صادق

Mohammed Sadique
(Lecturer in Urdu)
Govt. Higher Secondary School, Ramsar
Ajmer

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر

ek/;fed f'k{kk ckM] jkt LFkku] vtej

کمیٹی برائے ترتیبِ درسی کتاب

کتاب : انتخابِ نثر و نظم INTIKHAB-E-NASR-O-NAZM

برائے گیارہویں جماعت FOR CLASS XI

کنوینر

ڈاکٹر معین الدین شاہین

Dr. Moinuddin 'Shaheen'

(Convener)

P.G. Deptt. of Urdu, Govt. Dungar College, Bikaner

اراکین

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

Dr. Shahidul Haque Chishty

(Principal)

Govt. Adarsh Higher Secondary School, Gagwana (Ajmer)

شاہد اختر خان

Shahid Akhtar Khan

Principal (Retired)

Deptt., of Education Rajasthan

محمد صادق

Mohammed Sadique

(Lecturer in Urdu)

Govt. Higher Secondary School, Ramsar (Ajmer)

دو لفظ

طالبِ علم کے لیے درسی کتاب منظّم مطالعے اور مبصّرانہ صلاحیت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔مواد اور طریقۂ تعلیم کی رو سے درسی کتاب کے معیار کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ درسی کُتب کو دقیق (مشکل) اور محض مدح وقدح کی مثال نہیں بنانا چاہیے۔ درسی کتاب آج بھی درس و تدریس اور طریقۂ تعلیم کا ضروری اور اہم ذریعہ ہے۔ جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

گذشتہ کچھ برسوں سے مادھیمک شکشا بورڈ، راجستھان کے نصاب میں لسّانی اور تہذیبی اقدار کی نمائندگی کی کمی شدّت سے محسوس کی جارہی تھی۔تاہم صوبائی حکومت نے نویں جماعت سے بارہویں جماعت تک کے طلبا و طالبات کے لیے بذریعہ مادھیمک شکشا بورڈ راجستھان، اپنا نصاب مرتب کر کے نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اسی کے مطابق بورڈ نے درسی کتب، تسلیم شدہ نصاب کے مطابق تیار کرائی ہیں۔امید ہے کہ یہ کتب طلبا و طالبات میں فکر و تدبّر اور اظہار خیال کی صلاحیت کے روشن مواقع فراہم کریں گی۔

پروفیسر بی۔ایل۔چودھری

صدر

مادھیمک شکشا بورڈ راجستھان اجمیر

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب ''انتخابِ نثر و نظم'' بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر کی گیارہویں جماعت کے لیے، تسلیم شدہ اردو نصاب کے مطابق مرتّب کی گئی ہے۔ اس کتاب کو مرتّب کرتے وقت اُن تمام ضروری نکات اور اُمور کو ملحوظ رکھا گیا ہے جن کا تعلق تعلیم اور طالبِ علم سے ہوتا ہے۔ کتاب میں ایسے اسباق اور تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے جن میں ہندوستانی تہذیب، تمدّن اور صالح اقدار کی جھلک دکھائی دے۔ قومی یک جہتی کے جذبے کو تقویت دینے کی غرض سے اردو کے مسلم اور غیر مسلم شعراء و ادباء کی تخلیقات کو یکساں طور پر شامل کتاب کیا گیا ہے۔ طلباء کے معیار کا لحاظ رکھتے ہوئے مشکل الفاظ اور بوجھل تحریروں سے حتّی الامکان گریز کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اسباق و تخلیقات کے ذریعہ طلباء میں وُسعتِ مطالعہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسباق و تخلیقات میں تنوّع، توازن اور اعتدال قائم کرنے کی غرض سے موضوعات کی تکرار سے گریز و پرہیز کیا گیا ہے۔ ہر تخلیق اور مضمون کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی تحریر کیے گیے ہیں تا کہ طلباء کو معنی کی تلاش میں دقّتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے۔

تمام اسباق کے آخر میں بالترتیب مختصر ترین، مختصر اور تفصیلی سوالات شامل کیے گئے ہیں تا کہ طلبا کو بورڈ کے امتحان کے ساتھ ساتھ مقابلوں کے امتحانات کے لیے بھی شعوری طور پر تیّار کیا جا سکے۔ تخلیق اور تخلیق کار کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے تا کہ طلباء کو سبق اور مصنف و شاعر سے متعلق اہم معلومات فراہم ہو سکیں۔ شاملِ نصاب ادبی اصناف کا تعارف اور روایت کی تفصیل اس غرض سے پیش کی گئی ہے کہ

طلبا کو یہ علم ہو سکے کہ کس صنف کی کیا خصوصیات اور تقاضے ہیں۔خواتین اور صوبۂ راجستھان کی نمائندگی کی کوشش بھی کی گئی ہے۔قواعد اردو سے متعلق معلومات بھی شاملِ کتاب ہیں۔صحتِ متن اور طباعت کا حتّی الامکان لحاظ رکھا گیا ہے۔اُمید ہے کہ زیرِ نظر نصابی انتخاب طلباء کی تعلیم و تربیت میں معاون ثابت ہوگا۔

مُرتّبین

فہرست

حصّۂ نثر

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
☆	دولفظ	پروفیسر بی۔ایل۔چودھری	i
☆	پیش لفظ	مرتّبین	ii
۱	خطوط نگاری:		
	خطوط نگاری: تعارف اور مختصر تاریخ	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	1
	خطوطِ غالبؔ	مرزا اسداللہ خاں غالبؔ	4
	(i) بنام ہاتم علی مہرؔ		5
	(ii) بنام مرزا ہرگوپال تفتہؔ		7
	خط: ابوالکلام آزادؔ	ابوالکلام آزادؔ	10
	(i) بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی		11
۲	مضامین:		
	مضمون نگاری: ایک تعارف	ڈاکٹر شاہدالحق چشتی	15
	(i) گزرا ہوا زمانہ	سرسید احمد خاں	17

	(ii) ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کی روایت	ڈاکٹر شاہدالحق چشتی	27
	(iii) اردو شاعری میں قومی یکجہتی کا پیغام	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	40
۳	خاکہ نگاری:		
	خاکہ نگاری: مختصر جائزہ	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	54
	(i) گدڑی کا لال: نور خاں	مولوی عبدالحق	57
	(ii) استاد کی تلاش	مرزا فرحت اللہ بیگ	67
۴	سوانح نگاری:		
	سوانح نگاری: فن اور روایت	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	77
	(i) غالبؔ کے اخلاق و عادات	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	80
	(ii) مامون کا فضل و کمال اور عام اخلاق و عادات	علاّمہ شبلیؔ نعمانی	90
۵	خطوط نویسی، مضمون نویسی	شاہد اختر خان	100
۶	قواعد اردو (تعریف مع اقسام)	شاہد اختر خان	102

حصّۂ نظم

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱	صنفِ غزل: ایک تعارف	ڈاکٹر شاہد الحق چشتی	110
	غزلیات:		
	(i) میر تقی میرؔ		112
	☆ تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا	میر تقی میرؔ	115
	☆ غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا	میر تقی میرؔ	116
	(ii) خواجہ حیدر علی آتشؔ:		120
	☆ یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے	حیدر علی آتشؔ	122
	☆ کام ہمّت سے جواں مرد اگر لیتا ہے	حیدر علی آتشؔ	123
	(iii) مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ		127
	☆ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	130
	☆ ابنِ مریم ہوا کرے کوئی	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	131
	(iv) مولانا حسرتؔ موہانی		134
	☆ چپکے چپکے رات دن آنسوں بہانا یاد ہے	مولانا حسرتؔ موہانی	136
	☆ نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے	مولانا حسرتؔ موہانی	137
۲	صنفِ نظم: ایک تعارف	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	140

	منظومات:		
	(i) خوشامد	نظیرؔ اکبرآبادی	144
	(ii) ایک شکایت	اکبرؔ الہ آبادی	148
	(iii) جگنو	علاّمہ اقبالؔ	152
	(iv) ٹھنڈی انگلیاں	جوشؔ ملیح آبادی	159
۳	صنفِ مثنوی: ایک تعارف	شاہد اختر خان	164
	مثنویات:		
	(i) سرائے فانی	شوقؔ لکھنوی	165
	(ii) سیتا جی کی گریہ وزاری	دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی	172
۴	صنفِ مرثیہ: ایک تعارف	شاہد اختر خان	177
	مراثی:		
	(i) یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر	میر ببر علی انیسؔ	180
	(ii) کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے	مرزا سلامت علی دبیرؔ	189

سریع مطالعہ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
☆	اردو میں افسانہ نگاری کی روایت	محمد صادق	197
	منتخب افسانے:		
۱	نمک کا داروغہ (انتخاب)	منشی پریم چند	201
۲	آئی۔سی۔ایس (انتخاب)	علی عباس حسینی	217
۳	بھولا (انتخاب)	کرشن چندر	234
۴	دربان (انتخاب)	رشید احمد صدیقی	248

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

خطوط نگاری: تعارف اور مختصر تاریخ

پروفیسر خورشید الاسلام نے اپنے مضمون بعنوان ''خطوط نگاری'' میں یہ وضاحت کی ہے کہ زندگی بسر کرنے کی طرح خط لکھنا بھی ایک فن ہے۔ خط لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم کے ساتھ خونِ جگر بھی شامل ہوتا ہے۔ خط نویسی کے لیے کسی خاص اصول، خیال اور موضوع کی ضرورت نہیں ہوتی، خط اپنی بات خود پیدا کر لینے کا ہنر جانتا ہے۔ خط لکھنے کے لیے زندگی کا احترام از حد ضروری ہے۔ خط دراصل حسنِ اتفاق کا نام ہے۔ اگر خطوط عمدہ طرزِ بیان سے معمور ہوں تو انہیں ادبی کارنامے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یوں تو خط معمولی، عام اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوتے ہیں لیکن جب لکھنے والا زورِ بیان کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہی خط دستاویزی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خطوط ہر عہد میں لکھے گئے ہیں جن میں نجی باتیں بیان کرتے وقت رنگا رنگی، دلچسپی، تنوّع اور عمومیت پیدا کرنے کی کوشش خطوط نگاروں نے کی ہے۔ جس طرح ناول یا افسانہ لکھتے وقت فنکار کے ذہن میں سامعین و قارئین ہوتے ہیں ویسے ہی خط لکھتے وقت خطوط نگار کے ذہن میں مکتوب الیہ (جسے خط لکھا جائے) ہوتا ہے۔ خطوط نگاری کو مکتوب نگاری اور رقعہ نویسی بھی کہا گیا ہے۔ چونکہ خطوط مختلف ضرورتوں کے پیشِ نظر لکھے جاتے ہیں، اسی بنا پر خطوط کو نجی، کاروباری، شکایتی اور دفتری و سرکاری زمرے میں رکھا گیا ہے۔

اُردو میں خطوط نگاری کی ابتداء یوں تو غلام غوث بےخبرؔ، غلام امام شہید قتیلؔ اور اُن کے بعض معاصرین کے عہد میں ہو چکی تھی، جن کے خطوط کتابی صورت میں بھی دست یاب ہوتے ہیں لیکن بقول

پروفیسر خورشید الاسلام ان حضرات کے خطوط ''مکاتیب نہیں مہمات ہیں۔ اس دور کے اعتبار سے یہی اندازِ تحریر فطری تھا لیکن بدقسمتی سے ہمارے لیے ان میں دل چسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔'' اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ خطوط فارسی آمیز نثر میں لکھے گئے تھے۔ جو ادق نویسی کی مثال ہے۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے اُردو میں باقاعدہ خطوط نگاری کی صحت مندانہ روایت قائم کی۔ چونکہ غالبؔ کے خطوط ادبی آن بان اور شان سے مملو ہیں اس لیے انہیں غیر افسانوی نثر کا سنگِ میل کہا جا سکتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے پیش رو خطوط نگاروں کی طرح نہ تو لمبے چوڑے القاب و آداب کا استعمال کیا اور نہ ہی عبارت کی پیچیدگی میں الجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مختصر لفظوں میں بڑی باتیں کہی ہیں۔ مراسلے کو مکالمہ بنا دینا اُن کے خطوط کی اہم خصوصیت ہے۔ غالبؔ کے خطوط ہر اعتبار سے قابلِ تحسین تسلیم کیے گئے ہیں۔

غالبؔ کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے سرسیّد احمد خاں، مولوی نذیر احمد، محمد حسین آزادؔ، ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، علامہ شبلیؔ نعمانی، اکبرؔ الہ آبادی، چودھری محمد علی رُودولوی، مہدی افادی، علامہ اقبالؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ اور مولانا ابوالکلام آزادؔ وغیرہ نے اُردو خطوط نگاری کا پرچم لہرایا۔ اقبالؔ کے خطوط کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں عالمانہ بحث و تمحیث کے علاوہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور فلسفیانہ موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولوی عبدالحق اور پروفیسر محمود شیرانی کے خطوط حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ نے قلعہ احمد نگر کی قید میں رہتے ہوئے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو جو خطوط لکھے اُن کا مجموعہ ''غبارِ خاطر'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ آزادؔ نے بڑی حد تک غالبؔ کے خطوط سے کسبِ فیض کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور آلِ احمد سرورؔ کے خطوط عُمدہ نثر کے لیے مشہور ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی کے مکاتیب فلسفیانہ اندازِ بیان کا نمونہ کہے جاتے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں میں منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، میراجی اور سجّاد ظہیر کے خطوط عرصے تک موضوع بحث رہے۔ قرۃ العین حیدر کے خطوط پُرکشش اسلوبِ نگارش کی بہترین مثال قرار دیے گئے۔ جاں نثار اخترؔ اور صفیہ

اختر کے خطوط کے مجموعے ''خاموش آواز'' اور ''زیرِ لب'' پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ساغر نظامی نے اخبار ''ایشیا'' کا خطوط نمبر نکال کر کئی شعراء وادبا کے خطوط کو منظرِ عام پر لانے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ ماہنامہ ''نقوش'' نے یادگار خطوط اور مکاتیب نمبر شائع کیے۔ اب چونکہ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے اس لیے خطوط نگاری کی روایت پہلے کے مقابلے کم زور پڑنے لگی ہے۔ ادب کے سنجیدہ قارئین کا فرض ہے کہ خطوط نگاری چونکہ ہماری تہذیبی وتمدّنی وراثت ہے اس لیے اس کے تحفّظ کی سعی فرمائیں۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

مرزا غالبؔ بلند مرتبہ شاعر اور صاحبِ طرز انشا پر داز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ کی ولادت ۱۷۹۷ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ اُن کا سلسلۂ نسب تُرکمانوں سے ملتا ہے۔ اُن کے والد عبداللہ بیگ کے انتقال کے بعد اُن کے چچا نصراللہ بیگ کی سرپرستی میں غالبؔ کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی، غالبؔ کا بے مثال و باکمال نثری سرمایہ اُن کے اُردو و فارسی خطوط پر مشتمل ہے۔ غالبؔ کے خطوط غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں جن میں ایک طرف غالبؔ کی ذاتی زندگی کا علم ہوتا ہے تو دوسری طرف غالبؔ کے عہد اور روایت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط میں پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ غالبؔ شناسی کے ذیل میں بھی ان خطوط کی از حد اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ غالبؔ کے خطوط عزیز و اقارب، دوست احباب، تلامذہ اور بعض اہم شخصیات کے نام لکھے گئے ہیں۔ غالبؔ نے مُراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا اس کا ثبوت زیرِ نظر کتاب میں شامل غالبؔ کے خط بنام مرزا حاتم علی مہرؔ سے بھی ملتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط کے مجموعے 'عودِ ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کے عنوانات سے شائع ہوئے۔ بعض حضرات نے اپنے اپنے طور پر خطوطِ غالبؔ کے مجموعے اور انتخابات مرتب کر کے شائع کرائے۔ شاعری کی طرح اُن کے خطوط میں بھی بلند خیالی، جدّت طرازی، شوخی و ظرافت اور فلسفہ و تصوّف نمایاں ہے۔ غالبؔ تا عمر شاعری اور نثر نگاری کے حوالے سے اُردو کی خدمت کرتے رہے اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دو پہر ڈھلے اُن کا انتقال دہلی میں ہوا۔

خطوطِ غالبؔ

(۱)

خط بنام مرزا حاتم علی مہرؔ

مرزا صاحب!

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا، نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہؔ نے ہاتھرس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں، اور انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی تھی کہ دو کتابوں کی طلائی لوح تیار ہو گئی ہے۔ پھر اب ان کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟ اور ان پانچوں کتابوں کے تیّار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں، بعد منہائی لینے سات جلدوں کے، اِسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔

اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے، ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین آگے پیچھے۔ یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام کو جا بہ جا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔

جو میں نے کہا، انہوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپیے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں اس کے اِس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

۱۸۵۹ء

غالبؔ

(۲)

خط بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

کیوں صاحب! روٹھے ہی رہوگے یا منوگے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے، یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب، نہ لکھنے کہ وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

غالبؔ، سوموار، ۷ دسمبر ۱۸۵۸ء

مشکل الفاظ اور اُن کے معنی

الفاظ	معنی
اطراف وجوانب	طرف کی جمع اطراف یعنی طرفین، جانب کی جمع جوانب، آس پاس
بخل	کنجوسی
بیرنگ	بغیر ٹکٹ لگا لفافہ یا خط
ایجاد	وجود میں لانا، نئی بات پیدا کرنا
مکالمہ	گفتگو، ہم کلامی
مراسلہ	خط، چٹھی
خیر وعافیت	نیکی، بھلائی
زمزمہ پرداز	ترنم یا راگ میں گانے والا
مہتمم	اہتمام کرنے والا، منتظم، سربراہ کار
وصال	ملنا، ملاقات
لوحوں	تختیوں
مطبع	پریس، چھاپہ خانہ
صلے	انعام، بدلا، ہدیہ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ مُراسلے کو مکالمہ کس نے بنا دیا تھا؟

۲۔ ''میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا'' یہ بات کس نے لکھی؟

۳۔ ڈاک کا ہرکارہ دن میں کتنی بار غالبؔ کے خط لاتا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ آپ کے نصاب میں شامل غالبؔ کے خطوط کن حضرات کے نام لکھے گئے؟

۵۔ ''میں صرف خطوں کے سہارے جیتا ہوں'' غالبؔ نے یہ بات کسے لکھی؟

۶۔ ''کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی'' غالبؔ نے یہ بات اپنے خط میں کسے لکھی تھی؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ مرزا غالبؔ کی خطوط نگاری کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۸۔ مرزا حاتم علی مہرؔ کو لکھے گئے مرزا غالبؔ کے خط کی تشریح کیجیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار قابلِ احترام اور مایۂ ناز شخصیات میں ہوتا ہے۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۸ء میں مکہ معظّمہ میں ہوئی لیکن بعد میں آپ اپنے والدین کے ساتھ ہندوستان آ کر کلکتہ میں رہنے لگے۔ آزاد کا اصل نام محی الدین احمد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا لیکن آپ ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہوئے۔ آزاد نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرتے ہوئے عربی، فارسی اور اُردو میں مہارت حاصل کی۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا تب جنگِ آزادی کی تحریک زوروں پر تھی لہٰذا گاندھی جی کی تحریک سے متاثر ہو کر آپ نے جنگِ آزادی کی مشعل تھام لی۔ آپ نے انھیں دنوں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نامی دو اخبارات نکالے جن کا مقصد ہندوستانیوں کو آزادی کا پیغام دینا تھا۔ تحریکِ آزادی اور بے باک صحافت کی وجہ سے مولانا ابوالکلام آزاد عرصے تک انگریزوں کی قید میں رہے۔ حصولِ آزادی کے بعد آزاد ملک کے پہلے وزیرِ تعلیم بنائے گئے ۱۹۵۸ء میں آپ کا انتقال ہونے پر جامع مسجد دہلی کے باہری میدان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد شاعر اور نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب صحافی بھی تھے۔ اُن کی تقریروں کی طرح تحریریں بھی معیاری ہوتی تھیں جن میں اکثر عربی و فارسی الفاظ کے علاوہ آیاتِ قرآن اور اُنکا ترجمہ شامل ہوتا تھا۔ آپ کی کتابوں میں ''غبارِ خاطر'' (مجموعۂ خطوط) اور ''تذکرہ'' (خودنوشت) اہم ہیں۔ ''غبارِ خاطر'' میں مولانا کے وہ خطوط یکجا کیے گئے ہیں جو اُنھوں نے قلعہ احمد نگر کی قید میں رہتے ہوئے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل خط بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ یہ خط مولانا نے ۱۴ جون ۱۹۴۳ء کو شروانی صاحب کو لکھا تھا۔ خط کا انداز افسانوی ہے۔ منظر نگاری بھی اس میں شامل ہے فلسفیانہ انداز بھی جلوہ نما ہے مولانا آزاد نے اس خط میں بھی انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

خط بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی

قلعہ احمد نگر

۱۴ جون ۴۳ء

صدیقِ مکرم!

گذشتہ سال جب ہم یہاں لائے گئے تھے، تو برسات کا موسم تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔ اور جاڑے کی راتیں شروع ہو گئیں۔ پھر جاڑے نے بھی رختِ سفر باندھا اور گرمی اپنا ساز و سامان پھیلانے لگی۔ اب پھر موسم کی گردش اسی نقطہ پر پہنچ رہی ہے جہاں سے چلی تھی۔ گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف اُمنڈنے لگے ہیں، دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو چکیں، مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اس نگری میں کبھی موسم بدلتا ہی نہیں۔

یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی۔ اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا، نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ لیکن اس کی کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اس کے لئے کوئی انقلاب حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے۔

یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا تھا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی، مگر اب اُسے دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و تراوٹ، سب اس کے لیے یکساں ہو گئے۔ کل دوپہر کو اس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکا یک اس شاخِ بریدہ سے پاؤں ٹکرا گیا میں رُک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ میں

سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے، اس باغ میں بھی اُمید وطلب کے بے شمار درخت اُگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے ہیں لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ان کے لئے بہار وخزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

اکتوبر سے اپریل تک موسمی پھولوں کی کیاریاں ہماری دلچسپیوں کا مرکز رہیں۔صبح وشام کئی کئی گھنٹے ان کی رکھوالی میں صرف کر دیتے تھے۔مگر موسم کا پلٹنا تھا کہ ان کی حالت نے بھی پلٹا کھایا اور پھر وہ وقت آ گیا کہ ان کی رکھوالی کرنا ایک طرف کوئی بھی اس کا روادار نہ رہا تھا کہ ان اجل رسیدوں کو چند دن اور ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ایک ایک کر کے تمام کیاریاں اُکھاڑ ڈالی گئیں، وہی ہاتھ جو کبھی اونچے ہو ہو کر ان کے سروسینہ پر پانی بہاتے تھے، اب بے رحمی کے ساتھ ایک ایک ٹہنی توڑ مروڑ کر پھینک رہے تھے، جن درختوں کے پھولوں کا ایک ایک ورق حُسن کا مرقّع اور رعنائی کا پیکر تھا، اب جھلسی ہوئی جھاڑیوں اور روندی ہوئی گھاس کی طرح میدان کے ایک ایک کونے میں ڈھیر ہو رہا تھا، اور صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ جس بے سروسامان کو جلانے کے لیے لکڑیاں میسر نہ آئیں وہ انہیں کو چولھے میں جھونک کر اپنی ہانڈی گرم کر لے۔

گلگونۂ عارض ہے نہ ہے رنگ حنا تو!
اے خوں شدہ دل !تو تو کسی کام نہ آیا

زندگی اور وجود کے جس گوشے کو دیکھیے، قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ایسے ہی تماشے نظر آئیں گے۔انسانی زندگی کا بھی بعینہٖ یہی حال ہوا، سعی وعمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے اس کی رکھوالی کی جاتی ہے جو بے کار ہو جاتا ہے اس کو چھانٹ دیا جاتا ہے

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
رختِ سفر	سفر کا سامان
شاخ بریدہ	کٹی ہوئی ٹہنی
آمد آمد	آنا
قفس	پنجرہ، قید خانہ
بال وپر	بازو
اجل رسیدوں	موت کے قریب
ان کے سروسینہ	سر پر یعنی ان کے اوپر
مرقّع	تصویر
رعنائی	زیبائی۔خودآرائی۔خوبصورتی
مصرف	خرچ۔یعنی مقصد
گلگونۂ عارض	چہرے پر لگانے کا غازہ یعنی پوڈر
رنگِ حنا	مہندی کا رنگ
خوں شدہ	ہلاک
بعینہٖ	وہی، جوں کا توں
سعی وعمل	کوشش۔کام

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مجموعہ کا عنوان کیا ہے؟

۲۔ آپکے نصاب میں شامل خط مولانا ابوالکلام آزاد نے کسے لکھا تھا؟

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش کب اور کہا ہوئی؟

مختصر سوالات:

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خط میں استعمال مندرجہ ذیل الفاظ کے واحد لکھیے۔

انقلابوں۔ شگفتگیوں۔ آریاں۔ رعنائیاں۔

۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خط میں کن خاص موسموں کا ذکر کیا ہے؟

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے خود کو کٹی ہوئی نیم کی ٹہنی کیوں کہا؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح تحریر کرتے ہوئے ان کے اسلوبِ نگارش پر روشنی ڈالیے۔

۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خط کے پہلے اقتباس کی تشریح کیجیے۔

ڈاکٹر شاہدالحق چشتی

مضمون نگاری: ایک تعارف

کسی عنوان پر اپنے خیالات کو ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دینے کو مضمون کہا جاتا ہے۔ اردو میں صنفِ مضمون بھی دیگر اصناف ادب کی طرح مغربی ادب سے آیا۔ 'مضمون' جس کو انگریزی میں 'Essay' کہا جاتا ہے۔ اردو میں لفظ Essay کے لیے لفظ 'مضمون' کا سب سے پہلے استعمال سرسید احمد خاں نے کیا۔ صنفِ مضمون کی جامع تعریف 'انسائیکلو پیڈیا آف بری ٹینیکا' میں وضاحت وصراحت کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس کا ترجمہ مشہور نقاد نظیر صدیقی نے اس طرح کیا ہے۔

''ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے 'ایسے' اوسط لمبائی کا ایک ایسا مضمون ہے جو عموماً نثر میں ہوتا ہے اور جس میں سہل اور سرسری انداز میں کسی موضوع سے اور سچ پوچھیے تو صرف اُس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔''

مضمون نگاری کی دو اہم قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی 'انشائیہ نگاری' اور دوسری 'مقالہ نویسی'۔ مشہور انگریزی نقاد جانسن نے انشائیہ (Essay) کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔''

یعنی انسان کے ذہن میں کسی خاص موضوع پر جو خیال آتے ہیں، انھیں ترتیب کے ساتھ تحریر کر دینے کو انشائیہ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسنین انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''انشائیہ نثر کی غزل ہے، جو وارداتِ قلب سے زیادہ محشرِ خیال کی ترجمانی کرتی ہے۔''

اسی طرح مقالہ نویسی بھی مضمون کی وہ قسم ہے جس میں کسی خاص موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار مربوط طریقے سے اور ترتیب وار و عالمانہ انداز میں تحریر کیا جائے۔ مقالہ تخلیقی انداز کا ہوتا ہے جب کہ انشائیہ معلوماتی نوعیت کا۔ مضمون نگاری کے لیے کوئی مخصوص تکنیک یا ضابطہ نہیں ہے اور نہ ہی مضمون نگار پر کوئی پابندی یا بندش۔ البتہ مضمون نگار تخلیقی اور معلوماتی مواد سنجیدگی سے اور شگفتہ انداز میں پیش کرتا ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ سرسید نے اس صنف کو فروغ دیا اور ان کے ساتھ ان کے رفقاء نے بھی اپنی قوم وملت کی ابتری، بدحالی اور جہالت و پس ماندگی دور کرنے کی غرض سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ جن میں مذہبی، اخلاقی، تاریخی، فکری، معاشرتی، علمی و ادبی اور سیاسی و معاشی موضوعات پر زیادہ توجہ دی گئی۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں اس قسم کے مضامین شامل کیے گئے۔ اسی طرح مولانا حالؔی نے 'مقالاتِ حالؔی' میں، مولانا محمد حسین آزادؔ نے 'نیرنگِ خیال' میں اور مولانا شبلؔی نعمانی نے 'مقالاتِ شبلؔی' میں بھی علمی، ادبی، تحقیقی، تاریخی اور مذہبی موضوعات پر علاحدہ سے مضامین لکھے۔ ان کے بعد رسالہ 'مخزن' میں جس کے ایڈیٹر سر عبدالقادر تھے، انھوں نے بھی اس رسالہ میں اسی قسم کے مضامین شائع کیے۔

اردو میں مضمون نگاری کی لمبی روایت میں مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، عبدالحلیم شررؔ، مولانا وحید الدین سلیمؔ، مولوی عبدالحق، عبدالماجد دریا آبادی، قاضی عبدالغفار، مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ظفرؔ علی، مولانا ابوالکلام آزادؔ، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرورؔ، مجنوںؔ گورکھپوری، محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر احتشام حسین، کلیم الدین احمد اور پروفیسر خورشید الاسلام وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں اردو کی اُس عظیم اور محسن شخصیت کا نام ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سرسید احمد خاں ۶ ر ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ ر اکتوبر ۱۸۱۷ء بروز جمعہ بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر متقی ایک قناعت پسند، پرہیز گار اور نیک منش بزرگ تھے۔ والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا جو ایک روشن خیال، نیک سیرت اور شریف خاتون تھیں۔ سرسید کی تعلیم و تربیت میں ان کا سب سے زیادہ دخل رہا۔ رواجِ زمانہ کے مطابق سرسید کی ابتدائی تعلیم عربی و فارسی میں ہوئی۔ تعلیم مکمل کر کے ۱۸۳۸ء میں دہلی میں سرشتہ داری کے عہدے پر مامور ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے سب جج بن گئے۔ ۱۸۴۲ء میں مغل بادشاہ بہادر شاہ کے دربار سے انھیں عارفِ جنگ جوادالدولہ کا خطاب ملا۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب مسلمانوں کے لیے خاص طور پر انتہائی تباہ کن ثابت ہوا۔ ان کا سارا نظامِ حیات تباہ و برباد اور درہم برہم ہو گیا تھا۔ چونکہ سرسید اپنی قوم کے ہمدرد اور رہنما تھے لہٰذا انھوں نے ان کی علمی، اخلاقی اور معاشرتی پستی دور کرنے کے لیے اصلاحی کوششیں شروع کیں۔ اسی غرض سے سرسید کو مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کا خیال آیا اور وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۸۶۸ء میں ولایت تشریف لے گئے اور وہاں مغربی تعلیم اور طرزِ معاشرت کا مطالعہ کیا۔ ولایت سے واپس آ کر ۱۸۷۰ء میں رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کی بدحالی، جہالت اور قدامت پرستی کا احساس دلایا جائے اور انگریزی تعلیم کا شوق دلا کر مغربی خیالات اور نئی قدروں سے انھیں روشناس کرایا جائے تاکہ یہ قوم بھی ترقی کر سکے۔ اس رسالے نے سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور ان میں حرکت پیدا کی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں محمڈن

اورینٹل کالج قائم کیا جو آگے چل کر عالمی شہرت یافتہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے مشہور ہوا۔ بلاشبہ یہ سرسید کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اُس وقت مسلمان جو پستی، جہالت اور قدامت پرستی کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے ان کو مغربی تعلیم و نئی تہذیب سے روشناس کرا کر ان کی مشرقی روایات و اقدار کے امتزاج کے ساتھ ترقی کی راہ پر لائے۔ سرسید کی ان ہی اصلاحی خدمات کے صلے میں حکومت نے انھیں ۱۸۷۸ء میں ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔ ۱۸۷۸ء میں سرسید نے پنشن لے لی اور اپنا سارا وقت کالج کی ترقی اور قومی کاموں میں صرف کرنے لگے۔ اور آخری وقت تک قوم و ملک کی بھلائی میں لگے رہے۔ بالآخر ۵/ذی القعدہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۲۸/مارچ ۱۸۹۸ء بروز پیر علی گڑھ میں انتقال ہوا اور کالج کی مسجد کے صحن میں ہی دفن کیے گئے۔

سرسید بڑی شخصیت اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ ان کی تمام زندگی قوم وملت کی اصلاح وترقی کی کوششوں میں صرف ہوئی۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، مفکر، فلسفی اور جلیل القدر مصلح قوم تھے۔ قوم وملت کی اصلاح وترقی کے لیے نہ صرف خود کام کیا بلکہ اپنے دوستوں کو بھی اس کے لیے ترغیب دی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ایما پر ایک باصلاحیت اور مصلح قوم جماعت تیار ہوگئی۔ جن میں محسن الملک، وقار الملک، نواب عظیم یار جنگ، مولانا حالؔی، مولانا شبلؔی، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ جیسی نام ور ہستیاں شامل تھیں۔

سرسید کو اردو زبان کا سب سے بڑا محسن کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو کو تصنع، عبارت آرائی، مشکل بیانی اور فارسی آمیزش سے پاک کیا۔ سرسید کا طرزِ تحریر تصنع سے پاک سادہ اور پُر زور ہے۔ وہ اپنی بات کو دوسروں تک حیرت انگیز انداز میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ 'سرسید نے کام کی زبان میں کام کی باتیں لکھنا سکھائیں'۔ ان کی انشاء پردازی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ان کا اسلوبِ بیان اور زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ وہ مناسب الفاظ کے استعمال سے طرزِ بیان میں دلکشی پیدا کر دیتے تھے۔

جدید اردو نثر ہمیشہ ان کی مرہونِ منت رہے گی۔

سرسید شاعر بھی تھے اور آہیؔ تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے شاعری کو ترک کر دیا۔ اردو نثر میں ان کی تصانیف ''آثار الصنادید''، ''خطباتِ احمدیہ''، ''تاریخِ سرکشیِ بجنور''، ''اسبابِ بغاوتِ ہند''، ''تفسیر القرآن'' (نامکمل) اہم ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کی جہالت و پستی و قدامت پرستی کو دور کرنے کے لیے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے قصوں اور حکایتوں کے ذریعہ مسلمانوں کو علم حاصل کرنے اور نئی تہذیب سے روشناس کرانے کی کوششیں کی گئیں۔ زیرِ نظر مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' اسی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' سے ماخوذ ہے۔ انھوں نے اس مضمون کے ذریعہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر نیک اور اچھے کام کرنے کی نصیحت کی ہے۔

گزرا ہوا زمانہ

تہذیب الاخلاق بابت یکم صفر ۱۲۹۰ھ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے، رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے گھٹا چھا رہی ہے بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے، دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے، بڈھا نہایت غمگین ہے، مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر، وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کا غم بڑھتا ہے، ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے، اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے، جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹّی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اُس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلاّ اُٹھتا تھا ''ہائے وقت، ہائے وقت! گزرے ہوئے زمانے! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔''

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا، اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی

تھی، اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ ''اُہ ابھی بہت وقت ہے'' اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اُس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا! آہ وقت گزر گیا! اب پچتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ''ابھی وقت بہت ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراونی ہے، اندھیری گھٹا چھا رہی ہے، بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے، درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں، تب وہ چلا کر بولا ''ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراونی ہے جیسی یہ رات'' یہ کہہ کر وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اُس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اُس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمھارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی، بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اُس پر اُن گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹا جاتا تھا

اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا اب کیوں کر اس بدلہ ہو!

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اُس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پن یاد آیا جس میں کہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش، اُس نے اپنی اُس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنویں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کی جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اُس کے ذاتی اعمال کا اُسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں، مسجدیں ٹوٹ کر یا کھنڈر ہیں اور یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں، کنویں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اُس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا، یہ پچھلی سمجھ پہلے کیوں نہ سوجھی، اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا ''ہائے وقت، ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟''

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں، اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے، وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ

کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے پوچھا کہ تم کون ہو، وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے وہ بولی ہاں ہے، نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اُس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ ''واللہ لا ازید والا انقص'' ادا کر انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے، اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے، مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے، میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو، یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آیندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا ''ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں؟ ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، اس کو گلے لگا کر اس کی بی لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے

چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟ اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا کہ اس پشیمان بڈھے نے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے، میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا او خدا تو میری مدد کر، آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنوں! اور اے میری قوم کے بچو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تا کہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے، آمین۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
لڑکپن	بچپن
اشرفی	سونے کا سکّہ
ہم مکتب	ایک ہی مدرسہ میں پڑھنے والے
کج خُلقی	بدمزاجی، اکھڑپن
بیعت	مُرید بننا، اطاعت کا عہد
دلفریب	دل کو لبھانے والی۔خوبصورت
بَدوی	خانہ بدوش عرب
پشیمان	شرمندہ پچھتانے والا

مشقی سوالات:

مختصر ترین سوالات:

۱۔ اس مضمون کے مصنف کا کیا نام ہے؟

۲۔ سرسید احمد خاں نے کون سا مشہور تعلیمی ادارہ قائم کیا؟

۳ بڈھا کس کو یاد کر کے افسوس کر رہا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ بڈھے کو اپنے لڑکپن کے زمانے کی کون کونسی باتیں یاد آ رہی تھیں؟

۵۔ آسمان میں بڈھے کو نظر آنے والی دل فریب دلہن کون تھی؟ اور اُس نے بڈھے سے کیا کہا؟

۶۔ سرسید نے اِس مضمون کے آخری حصے میں نوجوانوں کو کیا نصیحت کی ہے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ اس مضمون میں بچہ کیا خواب دیکھتا ہے؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

۸۔ سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی بیان کیجیے اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی بھی ڈالیے۔

ڈاکٹر شاہدالحق چشتی

ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کی روایت

ہمارا ملک ہندوستان، دنیا میں وہ واحد مُلک ہے جہاں ہر مذہب وملت، رنگ ونسل کے لوگ صدیوں سے باہمی اتفاق ومحبت کے ساتھ مل جل کر رہتے آئے ہیں۔ملک کی آزادی کے بعد یہاں کے ہر شہری کو جہاں آزادی کے ساتھ اپنے مذہب وعقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے، وہیں اُسے اپنے مذہب وعقیدے کی تبلیغ واشاعت کا حق بھی ہمارا آئین دیتا ہے۔اتنا ہی نہیں آزادی سے سیکڑوں برس قبل سے ہی اس ملک کی یہ روایت رہی ہے کہ یہاں کے باشندوں نے بیرونی ممالک سے آنے والے افراد کا،خواہ وہ کسی بھی غرض سے ہندوستان آئے ہوں،خیر مقدم کیا ہے۔

اسی عظیم اورخوش گوار روایت کی وجہ سے سیکڑوں برس قبل جہاں چینیوں کے علاوہ یونانی اورافریقی سیّاح ہندوستان آئے، وہیں عرب وعجم کے مسلمان حکمران اورفقراواولیاے کرام نے بھی ہندوستان آکر اس ملک کواپنا مسکن بنایا،اور یہاں کے قدیم باشندوں کے ساتھ گھل مل کراپنی بقیہ زندگی اپنے مذہب و عقائد کے مطابق بسر کی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ ویسے تو آٹھویں صدی سے شروع ہو چکا تھا۔لیکن ان میں زیادہ تر مسلمان حکمران اورفوجی تھے۔جواپنے مقصد کوحاصل کرکے واپس اپنے وطن لوٹ گئے۔لیکن اِن ہی میں کچھ افراد فُقراواولیا بھی تھے جویہیں کے ہوکر رہ گئے۔

اِن ہی اولیاے کرام میں ایک اہم نام حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کا بھی ہے۔جو گیارہویں صدی میں ہندوستان تشریف لائے اور لاہور کواپنا مسکن بنایا۔ان کے بعد بھی دیگر صوفیاے کرام اور اولیاے عظام کی ہندوستان میں آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ان اولیاے کرام میں مختلف سلسلوں مثلاً قادریہ،

سہروردیہ،نقشبندیہ اور چشتیہ کے بزرگانِ دین شامل ہیں۔ان چاروں سلسلوں میں سلسلۂ چشتیہ کا اثر یہاں کے باشندوں پر سب سے زیادہ پڑا ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بعد بھی اس سلسلے کے کئی بزرگوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں جا کر ہندو مسلم اتحاد، گنگا جمنی تہذیب اور جذبۂ انسانیت کو زندہ رکھا۔ چشتیہ سلسلے کے اِن صوفیاے کرام میں سے کچھ اہم صوفیاے کرام کا ذکر مختصراً کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں۔ جو ساری دنیا میں خواجہ غریب نوازؒ کے نام سے مشہور ہیں۔خواجہ صاحب کی وِلادت ۱۴؍رجب ۵۳۳ھ مطابق ۲۶ مارچ ۱۱۳۹ء کو ایران کے مشہور شہر اصفہان کے قصبہ سجز میں ہوئی۔ جو وقت گذرنے کے ساتھ سنجر کہلانے لگا۔آپ کے والد بزرگوار کا نام خواجہ غیاث الدین حسنؒ اور والدہ کا نام بی بی اُمّ الوراع عرف ماہِ نور تھا۔آپ کی عمر جب محض ۱۴؍برس تھی تبھی والد کا وصال ۱۸؍دسمبر ۱۱۴۹ء کو ہوگیا تھا۔لھذا کم عمری میں ہی آپ کا دل دنیا سے اُچٹ گیا اور آپ تلاشِ حق میں گھر سے نکل گئے۔اس زمانے میں اسلامی تعلیم کے اہم مراکز بغداد، سمرقند و بخارا وغیرہ میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔اور مُستقل سفر کرتے ہوئے اپنے وقت کے علما و اولیاے کاملین سے ملاقاتیں کیں۔اور اُن سے فیض حاصل کیا،اب خواجہ صاحب کو ایک ایسے پیر و مرشد کی تلاش تھی جسے خواجہ صاحب کا دل قبول کرے۔ ۵۶۱ھ میں ان کی یہ تلاش و جستجو پوری ہوئی۔ جب بغداد میں چشتیہ سلسلے کے ولی کامل حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ (ہارونی) سے ملاقات ہوئی اور آپ اُن کے مُرید ہوئے۔خواجہ صاحبؒ تقریباً ۲۱؍برس تک اپنے پیر و مرشد سے روحانی تعلیم حاصل کرتے رہے۔۵۸۲ھ میں حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ نے انھیں اپنی خلافت سے نوازا۔اپنے پیر و مرشد کے ساتھ خواجہ صاحبؒ

نے مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے مکّۂ معظّمہ اور پھر مدینہ منوّرہ میں حاضری دی۔ سرکارِ دوعالم حضرت محمد ﷺ کے روضۂ پاک سے ہی آپ کو یہ اشارہ ملا کہ ہندوستان کی ولایت آپ کے سُپرد ہے۔ وہاں جائیں اور انسانیت، اخوت ومحبت اور بھائی چارہ کا پیغام دیں۔ اور خلق خدا کی خدمت کریں۔ خواجہ صاحب کو یہیں سے ہی 'نائب النبیؐ' کا لقب بھی عطا ہوا۔ آپ وہاں سے اجازت لے کر ملک در ملک اور کئی شہروں میں دینِ حق کی تبلیغ کرتے ہوئے ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء میں اجمیر آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ اور اسی سرزمین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا مسکن بنایا۔ آپ کا وصال اجمیر میں ہی ۶/رجب ۶۳۳ھ مطابق ۲۶/مارچ ۱۲۳۶ء کو ہوا۔ اسی شہر سے آپ نے دنیا کو امن وآشتی، اخوت و بھائی چارہ، مذہبی رواداری، انسانیت اور محبت ویگانگت کا پیغام دیا۔ ''اگر دلی ہندستان کا دل ہے تو اجمیر اس کی روح ہے۔'' آپ کے اخلاق، تعلیمات اور خداترسی کے نتیجے کی وجہ سے آٹھ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی اس سرزمین سے دنیا والوں کو امن وآشتی، باہمی اخوّت ومحبت، بھائی چارہ اور انسانیت کا پیغام مل رہا ہے۔ عوام تو ایک طرف بلکہ ملکوں کے شہنشاہوں، حکمرانوں اور سربراہوں نے آپ کی چوکھٹ پر حاضری دے کر فخر محسوس کیا ہے۔ آپ کے حُسنِ اخلاق، تعلیمات اور مذہبی رواداری کے جذبے سے متاثر ہو کر ہی لاکھوں بھٹکے ہوئے انسان سچائی اور راہِ حق پر آئے ہیں۔ اور آج بھی آپ کے آستانے سے لوگ فیض حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے اس مشن کو آپ کے مریدین اور خلفاء نے جاری رکھا۔ آپ کے مریدین اور خلفاء ہندوستان کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اِن آستانوں پر ہر مذہب وملّت، ذات پات اور رنگ ونسل کی کوئی قید نہیں۔ ہر شخص یہاں حاضر ہو کر محض انسانیت کے رنگ میں نظر آتا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بعد آپ کے اس مِشن کو آپ کے خلیفۂ اول حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، خلیفۂ سوم حضرت صوفی حمید الدین سوالی ناگوریؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ نے آگے بڑھایا۔ اور ہندوستان میں ہندو مسلم محبت ویگانگت

اوراتحاد کی داغ بیل کو پروان چڑھایا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ غریب نوازؒ کے پہلے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی پیدائش ۵۴۸ھ مطابق ۱۱۵۴ء میں ترکستان کے شہر اوشؔ میں ہوئی۔ حصولِ علم اور اپنے وقت کے مشہور صوفیا وعلماء سے ملاقات کے شوق میں مختلف مقامات کا سفر کیا۔ بعد فراغتِ علم بغداد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ملاقات ہوئی۔ اور اُن سے مرید ہوئے۔ جب خواجہ صاحبؒ ہندوستان تشریف لے آئے تو قطب صاحبؒ بھی اپنے پیرومرشد کی محبت اور اُن کی زیارت کی غرض سے بغداد سے چل کر خُراسان کے راستے ملتان اور پھر دہلی تشریف لے آئے۔ قطب صاحبؒ اپنے پیر کی زیارت کے لیے اجمیر آنا چاہتے تھے لیکن خواجہ صاحبؒ نے اُنھیں دہلی میں رہ کر ہی خدمتِ خلق کرنے کی ہدایت کی۔ لٰھذا اپنے پیرومرشد کی ہدایت کے مطابق دہلی کے مہرولی علاقے میں ہی مقیم ہوگئے۔ دہلی میں اقامت کے دوران ہی آپ نے قرآن حفظ کیا۔ قطب صاحبؒ یادِالٰہی میں ہمیشہ غرق رہا کرتے تھے۔ انھیں سِماع کا بڑا شوق تھا۔ دہلی میں خاص و عام دونوں طبقوں میں آپ کا بڑا اثر تھا۔ اس وقت دہلی میں سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی۔ وہ بھی حضرت کا معتقد اور مرید تھا۔ لٰھذا وہ روزانہ قطب صاحبؒ کی حاضری کے لیے جایا کرتا ہے۔ اس سے متاثر ہوکر کئی درباری اور عوام بھی ہزاروں کی تعداد میں آپ کے مرید ہوگئے۔ اور چشتیہ سلسلہ دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔ آپ کا وصال ۱۴؍ربیع الاوّل ۶۳۳ھ مطابق ۲۷نومبر ۱۲۳۵ء کو مہرولی میں ہوا۔ اور وہیں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ صدیوں سے ہزاروں زائرین روزانہ آپ کے مزار مبارک پر حاضر ہوکر فیضیاب ہوتے ہیں۔ جن میں سبھی طبقوں اور مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔

صوفی حمید الدین ناگوریؒ

صوفی حمید الدین ناگوریؒ کی پیدائش دہلی میں ۵۷۱ھ مطابق ۷۶-۱۱۷۵ء میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام احمد صوفی تھا جو خود بھی ولی اللہ تھے۔صوفی صاحبؒ دہلی سے ہجرت کر کے ناگور چلے آئے۔ اور بقیہ تمام زندگی عبادت الٰہی اور خدمتِ خلق میں بسر کی،صوفی صاحبؒ کی تعلیم وتربیت اپنے وقت کے مشہور علماے دین کی نگرانی میں ہوئی۔انھیں علمِ حدیث سے خاص دلچسپی تھی اور اپنے مریدوں کو بھی علمِ حدیث سیکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ایک مرتبہ آپ اجمیر تشریف لائے۔یہاں آپ کی ملاقات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہوئی پہلی ہی ملاقات میں دونوں بزرگ ایک دوسرے کو دیکھ کر متاثر ہوئے اور صوفی صاحبؒ خواجہ غریب نوازؒ سے مرید ہوگئے۔اور کافی عرصہ اپنے پیر کی خدمت میں اجمیر میں ہی گزارا۔صوفی صاحبؒ غریب نوازؒ کو اتنے عزیز تھے کہ ایک مرتبہ خواجہ صاحبؒ نے عالم کیف میں اپنے مرید سے فرمایا کہ اگر کوئی خواہش ہو تو بتائیں۔انشاءاللہ۔اللہ تعالیٰ اسے پوری کرے گا۔اس پر صوفی صاحبؒ نے عرض کیا کہ 'حضور میں تو خدا کی رضا میں راضی ہوں۔اپنے مولا کے علاوہ کوئی خواہش نہیں۔ خواجہ صاحبؒ اس جواب سے بے حد خوش ہوئے اور آپ کو 'سلطان التارکین،کا لقب عطا فرمایا تھا۔آپ اِس کے مُستحق بھی تھے۔کیونکہ آپ نے دنیا کی ہر لذت کو ترک کر دیا تھا۔ناگور کے علاقے کے بیشتر لوگ ہندو اور جین مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور گوشت نہیں کھاتے تھے۔لھذا آپ نے اُن لوگوں کے جذبات اور مذہبی اعتقاد کا خیال رکھتے ہوئے خود بھی گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔آپ کی بیوی نے گائے پال رکھی تھی،جسکی وہ خوب خدمت کرتیں اور خود روز اس کا دودھ دوہتی تھیں۔علاقے کے لوگوں نے جب آپ کا یہ حسنِ سلوک دیکھا تو سیکڑوں غیر مسلم بھی آپ کے معتقد ہوگئے۔اسی وجہ سے صدیاں بیت

جانے کے بعد آج بھی آپ کی درگاہ میں گوشت پکانا اور کھانا ممنوع ہے۔آپ نے زمین خرید کر کھیتی شروع کی اور اسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔عربی، فارسی اور دیگر علوم کے زبردست عالم ہونے کے باوجود آپ نے عوام سے اُن ہی کی مقامی بولیوں میں گفتگو کی اور رابطہ رکھا۔اس سے مقامی باشندوں میں آپ کے لیے محبت اور عقیدت بے انتہا بڑھ گئی۔عمر کے آخری ایّام کا بیشتر وقت آپ نے اجمیر میں گزرا۔ ۲۹ ربیع الآخر ۶۷۳ھ مطابق یکم نومبر ۱۲۷۴ء کو ناگور میں آپ کا وصال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔آپ کی درگاہ پر آج بھی روزانہ ہزاروں کی تعداد میں سبھی مذاہب کے ماننے والے حاضر ہوتے ہیں اور اپنی مرادیں پاتے ہیں۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ

آپ عرفِ عام میں بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں۔پنجاب کے علاقے میں سلسلۂ چشتیہ کی اشاعت وتبلیغ کے علمبردار آپ ہی ہیں۔بابا فریدؒ ملتان کے ایک گاؤں میں ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد شیخ جمال الدین یہاں قاضی کے عہدے پر مامور تھے۔بابا فرید کا پیدائشی نام مسعود تھا۔لیکن بعد ازاں اِس علاقے کے جلیل القدر بزرگ خواجہ فریدالدین عطار نے اُنھیں اپنا نام دیا۔ تیرہ برس کی عمر میں آپ ملتان آئے اور تعلیم حاصل کی۔یہیں آپ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے مرید ہوئے اور انھیں کے ساتھ دہلی آ گئے۔آپ ہمیشہ سخت ریاضت اور چلّہ کشی میں مصروف رہتے تھے۔لھذا آپ کی روحانیت بہت بلند ہوگئی تھی۔آپ کسی کو بھی ذرّہ برابر تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ایک مرتبہ جب خواجہ غریب نوازؒ اپنے مرید حضرت قطب صاحبؒ سے ملنے دہلی تشریف لائے تو قطب صاحبؒ نے اپنے تمام مریدوں کو پیرومرشد خواجہ غریب نوازؒ کی قدم بوسی کے لیے بلایا۔اُس وقت بھی بابا فرید چلہ کشی

میں مصروف تھے۔اور اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ دوسرے مرید آپ کو اُٹھا کر لائے۔خواجہ صاحبؒ نے بابا فریدؒ کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ قطب الدین تم نے ایک ایسا شہباز پالا ہے جو سات آسمانوں کی خبر لے گا۔یہ کہہ کر آپ نے بابا صاحبؒ کو بازوؤں سے اٹھایا اور اللہ سے اُن کے لیے دعا کی۔اِس طرح بابا صاحبؒ کو قطب صاحبؒ اور خواجہ صاحبؒ دونوں بزرگوں سے خلافت ملی۔اب آپ کی کرامتیں کثرت سے ظاہر ہونے لگیں۔ایک مرتبہ آپ نے تین دن کا مسلسل روزہ رکھا۔پھر افطار کرنا چاہا تو افطار کے لیے کچھ نہ تھا۔آپ نے زمین سے اُٹھا کر کچھ کنکریاں منھ میں رکھ لیں۔جو شکر بن گئیں۔اس واقع کے بعد آپ گنج شکر کے لقب سے مشہور ہو گئے۔آپ کے جماعت خانہ میں صوفیوں اور سنتوں کا ہجوم رہتا تھا۔جس میں تصوف پر گفتگو ہوتی تھی۔آپ خود بھی اس میں حصّہ لیتے تھے۔آپ پنجابی، عربی اور فارسی زبان کے عالم تھے۔گرونانک دیو بھی آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔اور یہی وجہ ہے کہ سکّھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب میں آپ کے سو سے زیادہ شَبد اور اور شلوک شامل ہیں۔بابا صاحبؒ نے کافی عرصہ ہانسی میں اپنے مرید شیخ جمال الدین احمدؒ کے پاس گزارا، اور آخر کار پنجاب کے قصبہ پاک پتن میں ۵/محرم ۶۶۴ھ مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۲۶۵ء کو وصال ہوا۔اجمیر میں خواجہ صاحبؒ کی درگاہ پر بھی آپ نے حاضری دے کر چلّہ کشی کی تھی۔یہاں آپ کا چلّہ گاہ آج بھی قائم ہے اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

شیخ جمال الدین ہانسویؒ

آپ بابا فریدؒ کے بڑے نامور خلیفہ، عالمِ دین، شاعر اور خطیب تھے۔بابا فرید سے بیعت ہوتے ہی آپ نے اپنا مال اور تمام جائیداد راہِ خدا میں خیرات کر دی۔سلسلۂ چشتیہ کو آپ نے جمالیہ سلسلے کے توسط سے آگے بڑھایا۔آپ کا وصال بابا فریدؒ کی حیات میں ہی ہو گیا تھا۔بابا صاحبؒ نے آپ کے

چھوٹے صاحبزادے شیخ برہان الدین کو بھی خلافت دی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ منوّر خطیب الدین اور پھر شیخ نور الدین خلیفہ بنے۔ شیخ منوّر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔ یہ چاروں حضرات اپنے وقت کے قطب تھے۔ ہانسی میں ایک ہی گنبد میں اِن چاروں کے مزارات ہیں۔ مجموعی طور پر یہ چہار قطب کے نام سے مشہور ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ

ہندوستان مین چشتیہ سلسلے کی بنیاد خواجہ صاحبؒ نے رکھی۔ اس کی تنظیم بابا فریدؒ نے کی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے میں اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔ آپ کا لقب محبوبِ الٰہی ہے۔ آپ ۶۳۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۲۳۸ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم مکمل کی اور پھر دہلی آ گئے۔ بابا فریدؒ سے آپ کو روحانی لگاؤ تھا۔ بیس سال کی عمر میں آپ اجودھن گئے اور بابا صاحبؒ کے مرید ہو کر خلافت حاصل کی، بابا فریدؒ کی آپ پر خصوصی توجہ تھی۔ آپ کا جماعت خانہ ہر مذہب اور ہر مسلک کے لوگوں کے لیے ہمیشہ کُھلا ہوا تھا۔ آپ نے غریبوں کے لیے لنگر شروع کیا۔ نذرانے کی ساری رقم اسی پر خرچ کرتے رہے۔ غریب نوازؒ کی درگاہ کے بعد آپ ہی وہ بزرگ ہیں جن کے آستانے پر ہر وقت زائرین کا میلہ لگا رہتا ہے۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ چشتیہ سلسلہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ آپ کی وفات ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں دہلی میں ہوئی۔

شیخ علاؤالدین احمد صابرؒ

آپ پیدائشی ولی تھے۔ اور بچپن سے ہی آپ کی بے شمار کرامات مشہور ہیں۔ یوپی کے شہر رُڑکی کے قصبہ کلیر میں آپ کا مزار ہے۔ ۱۳ ربیع الاول کو آپ کا وصال ہوا اور ہر سال کلیر میں آپ کا عرس بڑی عقیدت سے منایا جاتا ہے۔ آپ کے سلسلے میں شیخ شمس الدین تُرکؒ شیخ عبدالحقؒ اور شیخ عبدالقدوس

گنگوہویؒ جیسے نامور بزرگ اور عالم ہوئے ہیں۔آپ کے نام کی نسبت سے یہ سلسلہ صابری کہلاتا ہے۔ حضرت صابر کلیریؒ نے گنگا جمنی تہذیب قومی یکجہتی اور عالمی برادری کے اصولوں کو بے حد فروغ دیا۔

حضرت خواجہ امیر خسروؒ

طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ ایک مثالی صوفی، بہترین عالم اور کئی زبانوں کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور تُرکی زبانوں سے واقف، کئی راگوں اور ستار کے موجد حضرت امیر خسروؒ کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔اردو زبان کی پرورش کرنے والے، اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے محبوب، غرض ایک ہی شخصیت کے اتنے پہلو کہ دنیا دنگ ہے۔عوام میں اتنے مقبول کہ جس طرف سے گزرتے شعروں کی فرمائش ہوئی۔جس بزم میں جاتے سب سے نمایاں رہتے۔آپ کے بزرگ بلخ سے ہندوستان آئے۔آپ کی پیدائش پٹیالی میں ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں ہوئی۔حضرت نظام الدین اولیاء سے مرید ہوئے۔پیر و مرشد کے وصال کے بعد دہلی آئے اور وہیں ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء میں جاں بحق ہوئے۔

حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت خواجہ فخر الدین ۶۰۹ھ مطابق ۱۲۱۲-۱۳ء میں اجمیر میں پیدا ہوئے۔آپ نے قطب صاحبؒ کی صحبت میں تعلیم حاصل کی۔اور خواجہ صاحبؒ سے خلافت حاصل کی۔آپ کی تصوف کی تعلیمات سے ایک سماجی انقلاب پیدا ہوگیا۔خواجہ صاحبؒ کے وصال کے بعد بیس برس حیات رہے۔اور ہزاروں انسانوں کی رہنمائی کی۔۶۵۲ھ مطابق ۱۲۵۴ء میں اجمیر کے قصبہ سرواڑ میں آپ کا وصال ہوا۔اور وہیں آپ کا آستانہ ہے۔جو ہر خاص و عام کے لیے زیارت گاہ ہے۔

حضرت خواجہ حسام الدینؒ

آپ حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ کے صاحبزادے اور خواجہ غریب نوازؒ کے پوتے ہیں۔۶۲۲ھ مطابق ۱۲۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ یادالٰہی میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔خوفِ خدا اتنا تھا کہ ہر وقت کانپتے رہتے تھے اور اسی وجہ سے آپ کا دل سوختہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ جگر سوختہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ رجب ۷۴۱ھ مطابق ۱۳۴۰ء میں قصبہ سانبھر ضلع جے پور میں وصال ہوا۔ وہیں آپ کی درگاہ ہے۔

چشتیہ سلسلے کے ان چند اہم صوفیائے کرام کے علاوہ بھی کئی اور صوفیائے کاملین ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں جا کر انسانیت، محبت اور آپسی بھائی چارہ کا پیغام دیا۔ آج بھی ان کے آستانوں پر گنگا جمنی تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
تبلیغ	خدا کا حکم پہنچانا، احکام شریعت پہنچانا
آئین	قاعدہ، دستور العمل، ملک کا بنیادی قانون۔
سیّاح	سیر وتفریح کرنے والے۔ٹورسٹ
عَجم	عرب کے سوا کوئی ملک، بمعنی ایران
فُقرا	فقیر کی جمع
خُلفا	خلیفہ کی جمع
اولیا	ولی کی جمع، بمعنی اللہ والے لوگ
صوفیا	صحیح لفظ 'صوفیہ' صوفی کی جمع۔
خلافت	نبی یا پیر کی جانشینی، نیابت
ولادت	پیدائش
وِصال	ملاقات، کسی ولی کا انتقال کرنا
پیرومُرشد	بزرگ اُستاد
معتقد	ماننے والا، یقین رکھنے والا، جمع معتقدین
سماع	سُننا، بمعنی قوّالی
ممنوع	منع کیا گیا، ناجائز

بیعت	مُرید بننا، اطاعت کا عہد
سوختہ	جلا ہوا افسردہ
غریب نواز	حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا لقب
سلطان التارکین	حضرت صوفی حمید الدین ناگوریؒ کا لقب
گنجِ شکر	حضرت بابا فریدؒ کا لقب
محبوبِ الٰہی	حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا لقب
طوطیِ ہند	حضرت امیر خسروؒ کا لقب
جگر سوختہ	حضرت خواجہ حسام الدین چشتی کا لقب

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟

۲۔ خواجہ غریب نوازؒ کے پیر و مُرشد کا کیا نام ہے؟

۳۔ 'محبوبِ الٰہی' کس ولی کا لقب ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستان میں کہاں کہاں سے لوگ آتے رہے؟

۵۔ خواجہ صاحبؒ نے ہندوستان آ کر کیا پیغام دیا؟

۶۔ مندرجہ ذیل اولیائے کرام کے سنِ ولادت اور سنِ وصال بتائیے:۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔

حضرت صوفی حمید الدین ناگوریؒ۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ خواجہ غریب نوازؒ کے حالاتِ زندگی مفصّل بیان کیجیے اور ان کی تعلیمات پر روشنی بھی ڈالیے۔

۸۔ مندرجہ ذیل صوفیائے کرام کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کیجیے اور ان کی مجموعی تعلیمات پر روشنی ڈالیے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ۔ حضرت امیر خسروؒ۔

اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کا پیغام

تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ کسی بھی ملک میں امن وامان اور تعمیر وترقی کی بنیاد قومی یکجہتی پر قائم ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف رسم ورواج کو مانتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر عہد میں قومی یکجہتی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں زبان وادب کا بھی قابل قدر کردار رہا ہے۔ اردو جسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت کہا جاتا ہے، اس معاملے میں پیش پیش رہی۔ اس کے ثبوت میں تاریخ ادب اردو سے حوالے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سبق کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر کس درجہ اور کس قدر موجود ہیں۔

ڈاکٹر معین الدین شاہین

اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کا پیغام

دنیا کے کسی بھی زبان وادب کا بغور مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی زبان یا ادب ایسا نہیں جس میں قومی یکجہتی، اتفاق وارتباط، مہر ومحبت، وسیع النظری جیسے عناصر کی فروانی نہ ہو۔ خواہ وہ انگریزی ہو کہ سنسکرت، فارسی ہو کہ ہندی۔ اسی طرح اُردو زبان وادب میں بھی یہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اُردو کے ارتقائی سفر کا لسانی اعتبار سے جائزہ لینے پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اُردو مختلف قدیم و جدید زبانوں کا سنگم یعنی مخلوط زبان ہے، اس میں دُنیا کی اکثر ترقی یافتہ زبانوں کے اقدار و اوصاف نمایاں طور پر موجود ہیں۔ یعنی اردو بذاتِ خود یکجہتی اور اتفاق واتحاد کا مظہر ہے۔ اس میں ہماری گنگا جمنی تہذیب کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے جو اس کا مایۂ ناز اور طرۂ امتیاز وصف ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر کاظم علی خاں کی یہ تشریح بھی قابل لحاظ ہے کہ:

''جس طرح لفظ ''اردو'' الف، رے، دال، نیز واو جیسے چار بے جوڑ اور الگ الگ حرفوں کے ملاپ سے بنا ہے اسی طرح اُردو زبان بھی ہندوستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے میل ملاپ سے بنی ہے۔ لفظ ''اردو'' جن چار حروف کے ملاپ سے بنا ہے وہ ہمارے نزدیک اُردو زبان کے درج ذیل چار بنیادی اوصاف کے آئینہ دار ہیں:

(۱)	الف	=	اُخوّت (بھائی چارہ)	ا
(۲)	ر	=	رواداری (تمام مذاہب کا احترام اور ان دھرموں کے ماننے والوں سے محبت)	ر

(۳)	دال	=	دوستی انفرادی سطح کے ساتھ ساتھ اجتماعی وعالمی پیمانے کی انسان دوستی)	د
(۴)	واؤ	=	وحدت (ایکتا)	و

ان معنوں میں ہم یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی تاریخ اور قومی یکجہتی کی تحریک دونوں ایک ہی ہیں۔ اردو کو بادشاہوں اور عوام دونوں نے دل سے لگایا اور اس کے ادب کا خیر مقدم کیا۔ یہ زبان درباروں اور خانقاہوں کی یکساں طور پر زینت بنی ہے۔

ابتداً اُردو میں قومی یکجہتی کے نقوش تلاش کریں تو حضرت امیر خسرؔو کا نام ہماری زبان پر آتا ہے، جنہیں اردو والے اپنا پہلا شاعر اور ہندی والے 'گوی' تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ہندی اور اردو بلکہ فارسی میں بھی ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ وطن کی محبت میں وہ خود بھی سرشار و سرمست ہوئے اور دوسروں کو بھی سرشار و سرمست کیا ہے۔

اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ تصوّف چونکہ ایک روحانی فلسفہ ہے جس میں ہر شخص کے جذبات کا احترام، بنی نوع انسان سے محبت، مذہب سے عقیدت اور سچائی کی تلقین ملتی ہے تاہم اردو زبان میں محبت، رواداری، وسیع النظری اور احترامِ آدمیت کا تصور کارفرما ہوتا چلا گیا۔ اس کا ثبوت بعض متقدمین و متوسطین شعرائے کرام کے درج ذیل اشعار سے بھی فراہم ہوتا ہے۔

بت خانہ کھود ڈالیے ، مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑنا یہ خدا کا مقام ہے

سوداؔ

کوئی تسبیح اور زنّار کے جھگڑے میں مت بولو
کہ آخر ایک ہیں، آپس میں دونوں بیچ رشتہ ہے

ناجیؔ

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دَیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میرؔ

شیخ نے مسجد بنا ، مسمار بُت خانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

میر اعلیٰ

وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ ہے۔ کہیں زنّار کہتے ہیں

مرزا غالبؔ جنہیں اردو کا عظیم المرتبہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے انہوں نے بھی اپنی شاعری میں ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ کرشن چندر کا قول ہے کہ:

''غالبؔ سرتاپا ہندوستانی تھے، ان کی تہذیب اسی ملک کی تہذیب ہے، اور جس زبان میں اُن کا کلام زندہ ہے اس کے گل بوٹے اسی ملک کی مٹی سے پھوٹے ہیں''۔

کرشن چندر کے مذکورہ بیان کی تائید غالبؔ کے مندرجہ ذیل اشعار سے بھی ہوتی ہے ۔

ہندوستان کی عجب سرزمیں ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور

جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اِسی ملک میں ظہور

1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کا نقشہ ہی بدل گیا تھا ۔ ہندوستانیوں کی شکست نے ان کے حوصلوں کو پست کر دیا تھا لیکن بسا غنیمت کہ ہمارے شعراء و ادباء نے نئی روح پھونک دی اور ہمت و حوصلے سے کام لینے کی نصیحت اور اتحاد و اتفاق کا پیغام دیا۔ اس ذیل میں حالیؔ شبلیؔ، آزادؔ اور ان کے معاصر شعرائے کرام کے اسمائے گرامی قابل تعریف ہیں پروفیسر مجاور حسین نے اپنی کتاب ''اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر'' میں اشارہ کیا ہے کہ:

> ''ہندوستانی شاعری میں باقاعدہ طور پر وطنی شعور کو شاعری کے سانچے میں ڈھالا گیا اور اب تک قومی یک یکجہتی کے جو عناصر علامتوں اور تصوّرات کے روپ میں چھپے ہوئے تھے وہ اس طرح کھل کر سامنے آ گئے کہ کسی تعبیر و تشریح کی ضرورت نہ رہی ۔ آزادؔ، حالیؔ نے جس طرح کی شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، شبلیؔ درگا سہائے سرورؔ، مہاراج بہادر برقؔ، سورج نرائن مہرؔ جگت موہن لال رواںؔ، اقبالؔ اکبرؔ، چکبستؔ اور جوشؔ نے انہیں دیواروں پر قومی یکجہتی کا تاج محل تعمیر کیا''۔

حالؔی کی نظمیں 'بَر کھا رُت' 'حُبّ الوطنی' ''مسدّس مدّ و جزرِ اسلام'' وغیرہ قومی یکجہتی کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ حالؔی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لفظ ''قوم'' کا استعمال ہندوستانیوں کے لیے کیا۔ حالؔی قوم و وطن کا جدید اور ترقی یافتہ تصور رکھتے تھے اور ملک کے اتّحاد و یکجہتی کے تحفظ کی تلقین ان کا فریضۂ اوّلین تھا۔

تم اگر چاہتے ہو وطن کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کوئی برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھ کی پتلیاں سب کو

نظیرؔ اکبر آبادی نے ہندو اوتاروں، دیوی دیوتاؤں، میلوں ٹھیلوں، موسموں اور تہواروں مثلاً بسنت، ہولی، دیوالی، راکھی، بلدیو جی کا میلہ، گرونانک، درگا جی کے درشن، شری کرشن، مہادیو جی کا بیاہ جیسے موضوعات پر کثرت سے نظمیں کہی ہیں جن میں عقیدت و احترام کا جذبہ دل کی گہرائی تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔

نظیرؔ کی طرح ہی اکبرؔ الہ آبادی نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ ہندو مسلم اتّحاد اور بھائی چارہ کا سبق دیا ہے۔

کہتا ہوں میں ہندو و مسلمان سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر، پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو، مگر ایک رہو

حالؔی اور محمد حسین آزادؔ نے وطن پرستی اور قومی یکجہتی کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ڈاکٹر محمد اقبالؔ ثابت ہوئے۔ 'بانگِ درا' کا آغاز ہی ''ہمالہ'' جیسی نظم سے ہوتا ہے جو بذاتِ خود قومی یکجہتی کی علامت ہے۔ انہوں نے ''تصویرِ درد'' ''ہمالہ'' ''رام چندر جی'' ''نیا شوالہ'' ''سوامی رام تیرتھ'' ''بھرتری ہری'' ''لکشمن جی'' ''گرونانک'' ''شیکسپیئر'' جیسی متعدد نظمیں لکھیں۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا''

جیسے قومی گیت کی تخلیق کی۔ اقبالؔ واقعی قومی و وطنی شاعر تھے۔ ان کی ابتدائی دَور کی تخلیقات سے قطعِ نظر ۱۹۳۶ء میں (اقبالؔ کی وفات سے دو برس قبل) لکھی گئی نظم ''شعاعِ امید'' سے بھی اقبالؔ کی حُبُ الوطنی کا ثبوت ملتا ہے، اس نظم کا یہ شعر خصوصی توجہّ کا حامل ہے ؎

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

اس کے علاوہ ان کی منظومات کے بعض اشعار بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں جن میں قومی و وطنی جذبہ کی سرشاری موجود ہے، چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں: ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اُس کو امامِ ہند

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِکامل نے جگایا خواب سے

چشتی نے جس زمیں پہ پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چُھڑایا
تاتا ریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

پنڈت برج نرائن چکبستؔ ، پنڈت تلوک چند محرومؔ ،شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی ،مولانا محمد علی جوہرؔ ،مولانا ظفرؔ علی خاں ،حسرتؔ موہانی، اشفاق اللہ خاں حسرتؔ ،صفیؔ لکھنوی، جعفر علی خاں اثرؔ ،علی جوادزیدی اور فراقؔ گورکھپوری وغیرہ جیسے اردو کے محبّ شعرائے کرام نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اتفاق ،اتحاد، ارتباط ہمدری اور مہر ومحبت کا پیغام دیا۔ بطور مثال چند اشعار دیکھیے :۔

اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

چکبستؔ

ہندو مسلم بھائی بھائی
تفریق کیسی ، کیسی لڑائی
ہندو ہو کوئی یا مسلماں
عزّت کے قابل ہیں سب انساں

تلوک چند محرومؔ

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذان سے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستان سے

مولانا ظفر علی خاں

لفظ ہم میں جس طرح ''ہ''''م'' ہیں شیر وشکر
چاہیے ہندو مسلماں یوں ہی مل جُل کر رہیں

صفی لکھنوی

نہ تو ہندو کوئی دیکھا نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

اثر لکھنوی

سر زمینِ ہند پر اقوام عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ، ہند وستاں بنتا گیا

فراق گورکھپوری

دورِ جدید میں جن شعرائے کرام نے قومی یکجہتی کی شمع کو اپنا خونِ جگر صرف کر کے فروزاں کیا اُن میں فیض احمد فیض ،جگر مراد آبادی ، مجاز لکھنوی ، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر ،علی سردار جعفری، کیفی اعظمی ،مخدوم محی الدین ،آنند نرائن ملّا ،احمد ندیم قاسمی ،ن۔م۔راشد، میراجی ،اختر شیرانی ، جگن ناتھ آزاد، کالی داس گپتا رضا، زبیر رضوی وغیرہ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ساحر کی نظم ''یہ کس کا لہو ہے''، ''اے شریف انسانوں'' اور جاں نثار اختر کی نظم ''آواز دو ہم ایک ہیں'' اور کیفی اعظمی کی نظم ''آخری مرحلہ'' قومی یکجہتی کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ مذکورہ شعرائے کرام کے بعض اشعار بھی اس سلسلے میں لائقِ تحسین ہیں:

اُٹھو نقارۂ افلاک جگا دو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اُٹھ کر

مجازؔ لکھنوی

وطن کی شمعِ آزادی کبھی گُل ہو نہیں سکتی
کہو ہندوستاں کی جے، کہو ہندوستاں کی جے

مخدوم محیؔ الدین

دھرتی ہے یہ گوتمؔ کی ویر اشوکِ اعظم کی
دھرتی ہے یہ چشتیؔ کی نانکؔ میراؔ ، تُلسیؔ کی
دھرتی ہے یہ باپوؔ کی اپنے پیارے نہروؔ کی
اپنا نعرہ ایک ہے
بھارت سارا ایک ہے

(جاں نثار اخترؔ)

داسؔ نے خونِ جگر سے اسے سیراب کیا
تشنۂ خون تھی خاکِ چمنستانِ وطن

اخترؔ شیرانی۔نظم ''اسیرانِ وطن کی یاد میں''

زبیرؔ رضوی کا مشہور قومی گیت (نغمہ) ''یہ ہے میرا ہندوستان'' قومی یکجہتی کی تحریک میں از حد معاون ثابت ہوا ہے۔بطور مثال اس نغمے کا ایک بند دیکھیے :

غالبؔ اور ٹیگور یہیں کے، میراؔ کالی داس
یہیں ہوا تھا سچائی کا گوتم کو احساس

یہیں لیا تھا ساتھ رام کے سیتا نے بَن باس
یہ ہے میرا ہندوستان، میرے سپنوں کا جہان

کالی داس گپتا رضاؔ کا یہ شکوہ بھی بجا ہے:

بیکار کی باتوں نے اُبھارا ہم کو
عیسیٰؑ بھی محمدؐ بھی ہے پیارا ہم کو
تقسیم مذاہب سے نہیں کچھ بگڑا
انسان کی تقسیم نے مارا ہم کو

لیکن اسکے ازالہ کا پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ نے کتنا صحیح طریقہ بتایا ہے ؎

اک نیا ماحول اک تازہ سماں پیدا کریں
دوستو! آؤ محبت کی زباں پیدا کریں
ہو سکے تو اندازۂ گلستاں پیدا کریں
اپنے ہاتھوں سے نہ پھر دورِ خزاں پیدا کریں

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری میں انسان دوستی، مہر و محبت، وطن پرستی، وسیع النظری اور احترامِ آدمیت کا تصوّر جیسے جذبات پھولوں کی طرح مہک رہے اور ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ اور یہی وہ جذبات ہیں جو قومی یک جہتی کو تقویت دینے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
یک جہتی	ایکتا، دوستی، اتحاد
وسیع النظری	بلند خیالی، رواداری
سنگم	ملنا، اکٹھا ہونا، یکجا ہونا
مظہر	ظاہر ہونا
عظمت	بزرگی، بڑائی شان وشوکت
تلقین	نصیحت کرنا
تصوّر	خیال، تفکر، سوچ
تحفّظ	حفاظت کرنا
صَرف	خرچ کرنا
معاون	مددگار
ازالہ	دور کرنا، مٹانا
محبّانِ وطن	وطن سے محبت کرنے والے
اتفاق وارتباط	میل جول، یگانگت
فراوانی	زیادتی، کثرت، افراط
مخلوط	ملی جُلی

خیر مقدم	استقبال کرنا
سرشار	لبریز، نشے میں چور
بنی نوع انسان	بشر، انسان کی اولاد
اُخوت	بھائی بندی، بھائی چارہ
منظومات	نظم کی جمع
فروزاں	روشن کرنا
تقویت	طاقت مضبوطی
شکوہ	شکایت
متعدد	کئی تعداد، لاتعداد

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ کس زبان کو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار کہا جاتا ہے؟

۲۔ سبق ''اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کا پیغام'' کے مصنف کا کیا نام ہے؟

۳۔ سبق کے مطابق ڈاکٹر اقبالؔ نے قومی یک جہتی پر کون کون سی نظمیں لکھیں؟

مختصر سوالات:

۴۔ ہندوستان میں قومی یکجہتی کس طرح قائم ہوسکتی ہے؟

۵۔ کس قسم کے جذبات قومی یکجہتی کو تقویت پہچانے میں معاونت کرتے ہیں؟

۶۔ سبق کے مطابق نظیرؔ اکبرآبادی نے کن کن قومی موضوعات پر نظمیں تخلیق کیں؟

تفصیلی سوالات

۷۔ سبق ''اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کا پیغام'' کا خلاصہ لکھیے۔

۸۔ سبق ''اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کا پیغام'' سے آپ کو کیا درس ملتا ہے؟

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

خاکہ نگاری: مختصر جائزہ

اصلاحِ ادب میں خاکہ اُس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کی سیرت، شخصیت، رفتار و گفتار، خوبیاں و خامیاں اور طرزِ زندگی کی چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی تصویریں اشاروں، کنایوں اور ایجاز و اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ پروفیسر محمود الٰہی نے خاکہ نگاری کے متعلق بجا طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''خاکہ نگاری بہت مشکل صنف ہے اور پھر خوانِ مضمون کے میزبانوں کے غرض و جوہر کو چند صفحات میں سمیٹ لینا اور بھی مشکل کام ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں سوانح نگاری کے آداب کی پابندی بھی لازمی ہے اور ساتھ ہی یہ دریا کو کوزے میں بند کر لینے کے سلیقے کی بھی متقاضی ہے۔'' خاکہ نگاری کے لیے مرقّع نگاری کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔

اُردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش شعرائے اُردو کے تذکروں میں ملتے ہیں جن میں ''نکات الشعراء'' (میر تقی میرؔ) ''تذکرۂ ہندی'' (مصحفیؔ) ''گلشنِ بے خار'' (شیفتہؔ) اور ''مجموعۂ نغز'' (قدرت اللہ قاسمؔ) وغیرہ اہم ہیں۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' کے ذریعے با قاعدہ طور پر خاکہ نگاری یا مرقع نگاری کو فروغ دیا۔ بقول نور الحسن نقوی محمد حسین آزادؔ کی ''آبِ حیات'' میں ''بیسیوں چلتی پھرتی اور منھ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں، اسے تصویروں کا خوبصورت البم کہا جائے تو بجا ہے۔'' مولانا آزادؔ کے علاوہ انشاء اللہ خاں انشاؔ نے ''دریائے لطافت'' اور علامہ شبلیؔ نعمانی کی ''شعر العجم'' اور دیگر سوانحی تصانیف میں شخصیات کے خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ حالیؔ کی ''یادگارِ غالبؔ''، ''حیاتِ جاوید'' اور ''حیاتِ سعدیؔ'' اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مذکورہ اکابرین کی روایت کو فروغ دیتے ہوئے ۱۹۳۷ء میں اپنے

اُستاد مولوی نذیر احمد کا مفصّل خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' لکھ کر خاکہ نگاری کو صنفی اعتبار سے معیار و وقار بخشا۔ ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین کے گیارہ مختصر خاکوں کا مجموعہ ''کیا خوب آدمی تھا'' شائع ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں بشیر احمد ہاشمی کے خاکوں کا مجموعہ ''گفت وشنید'' منظرِ عام پر آیا۔ مولانا شوکت تھانوی کے خاکوں کے دو مجموعے بعنوان ''شیش محل'' اور ''قاعدے بے قاعدے'' ۱۹۴۴ میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہوئے۔

خاکہ نگاری کی روایت اُس وقت مستحکم ہوئی جب ۱۹۵۰ء میں ''بابائے اُردو'' مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس مجموعے میں شامل 'مولانا محمد علی جوہرؔ'، 'نور خاں' اور 'نام دیو مالی' کے خاکوں کو خاصی شہرت ملی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے خاکہ نگاری پر خصوصی توجہ صرف کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے خاکے کثیر تعداد میں ''گنج ہائے گراں مایہ'' ''ہم نفسانِ رفتہ'' ''آشفتہ بیانی میری'' ''شیخ نیازی'' ''ذاکر صاحب'' ''خنداں'' اور ''مضامینِ رشید'' کی صورت میں شائع ہوئے۔

سعادت حسن منٹو نے جہاں افسانہ نگاری میں اپنا منفرد مقام بنایا وہیں خاکہ نگار کی حیثیت سے ایسے خاکے سُپردِ قلم کیے جو اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ جون ۱۹۵۲ء میں منٹو کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''گنجے فرشتے'' ۱۹۵۵ء میں دوسرا مجموعہ ''لاؤڈ اسپیکر'' اور ۱۹۵۶ء میں تیسرا مجموعہ ''شخصیتیں'' شائع ہوا۔ پروفیسر سید اعجاز حسین کے خاکوں کی مختصر سی کتاب ۱۹۵۴ء میں بعنوان ''ملکِ ادب کے شہزادے'' شائع ہوئی جس میں چوالیس شاعروں کے مختصر خاکے شامل ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں عبدالمجید سالکؔ کے بیس خاکوں کا مجموعہ 'یارانِ کہن' شائع ہوا جسے اکثر مبصّرین نے قابلِ مطالعہ قرار دیا ہے۔

مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے کے تحت سعادت حسن منٹو،

اسرارالحق مجاؔز اور اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ بعنوان ''دوزخی'' لکھ کر مقبولیت حاصل کی۔ علاوہ ازیں ''ننّھی کی نانی'' اور ''بچھو پھوپی'' بھی عصمت چغتائی کے یادگار خاکے ہیں۔

اشرف صبوحؔی دہلوی نے اپنے پندرہ عدد خاکوں کا مجموعہ ''دلّی کی چند عجیب ہستیاں'' قارئین کی نذر کیا۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں ضیاءالدین برنی کا مجموعہ ''عظمتِ رفتہ'' چھپا جس میں ۱۹۳ ایسی شخصیات کے خاکے شامل ہیں جو مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ مشہور اہلِ قلم شاہد احمد دہلوی کے سترہ خاکوں کا مجموعہ ''گنجینۂ گوہر'' ۱۹۶۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ انشا پردازی کی بہترین مثال ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے خاکوں کے مجموعوں ''زرگذشت'' اور ''آبِ گم'' کو ادبی حلقوں میں حسنِ قبول حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاؔد کی کتاب ''چیدہ شخصیتیں'' خاکہ نگاری کی اچھی نظیر پیش کرتی ہے۔ علی جوؔاد زیدی کی کتاب ''ہم قبیلہ'' کے علاوہ خواجہ حسن نظامی، احمد جمال پاشا، مختار مسعود اور رئیس جعفری کے خاکوں سے خاکہ نگاری کو تقویت ملی۔

اُردو میں وقتاً فوقتاً ایسے خاکے بھی منظر عام پر آتے رہے جو کسی ایک شخصیت سے متعلق مختصر کتاب یا مونو گراف کی حیثیت رکھتے ہیں، ایسے خاکوں میں ''مخدوؔم محی الدین'' (علی سردار جعفری) ''ساحؔر لدھیانوی'' (کیفؔی اعظمی) اور ''دیویندر ستیّارتھی'' (ساحؔر لدھیانوی) وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری کے ذیل میں چراغ علی حسرؔت کی کتاب ''مردمِ دیدہ'' غلام احمد فرقؔت کی ''نارو'' اور حکیم احمد چراغ کی ''خونِ بہا'' خاکوں سے متعلق عمدہ تحریریں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عہدِ حاضر میں مجتبیٰ حسین، اطہر پرویز اور ندؔا فاضلی وغیرہ خاکہ نگاری کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

مولوی عبدالحق

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی ولادت ۱۸۷۰ء میں ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ آپ نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محمڈن کالج، علی گڑھ سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ سرسید اور حالؔی سے رسائی عبدالحق کی علمی و ادبی زندگی کے لیے فالِ نیک ثابت ہوئی۔ ابتداً آپ نے حیدرآباد (دکن) کے ایک اسکول میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ بعدازاں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اسی دوران انجمن ترقی اُردو کے سیکریٹری رہتے ہوئے ایک تنقیدی و تحقیقی رسالہ ''اردو'' جاری کیا کچھ عرصے بعد اورنگ آباد کالج کے پرنسپل اور پھر عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد میں شعبۂ اُردو کے صدر رہے۔ پنشن یاب ہوکر دہلی چلے آئے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے اور وہیں ۱۹۶۱ء میں انتقال فرمایا۔

مولوی عبدالحق کا شمار نامور محقق اور قابل قدر ناقد کی حیثیت سے اُردو ادب میں ہوتا ہے۔ آپ کی اہم ترین کتابوں میں ''مقدمات عبدالحق''، ''خطباتِ عبدالحق'' اور ''تنقیداتِ عبدالحق'' کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں کئی معروف و غیر معروف شخصیات سے متعلق خاکے شامل ہیں۔

''گڈری کا لال: نور خان'' بھی انھیں میں سے ایک خاکہ ہے۔ یہ خاکہ دل کشی، کردار نگاری اور سیرت نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ چونکہ نور خاں صاف گو اور کھرے انسان تھے اس لیے مولوی عبدالحق نے حقیقت و صداقت کے پیش نظر اس معمولی سپاہی کی اعلیٰ انسانی صفات کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور خاں کی سادگی، نیکی، صاف گوئی اور شرافت نے عبدالحق کو اُن کا خاکہ کھینچنے پر مجبور کیا۔

مولوی عبدالحق

گدڑی کا لال :نورخاں

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں، میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے، انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔ ع

پھولوں میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

نور خاں مرحوم کنٹنجنٹ کے اول رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدرآباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہوسکتا تھا۔ بہت دیکھ بھال ہوتی تھی، بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے، تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کیے جائیں۔ یہی وجہ تھی کنٹنجنٹ والے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ قید بھی اُٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہ رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے، اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے، ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے، کرنل نواب اصغر الملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں۔ کنٹنجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسط سے اور بعض اور ذرائع سے حیدر آباد ریاست میں آ کر ملازم ہو گئے۔ ان میں بہت سے نواب، کرنیل، میجر، کپتان اور بڑے عہدیدار

ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے؟

اول رسالے کے بعض لوگوں سے بعص لوگوں کو معلوم ہوا کہ خاں صاحب مرحوم فوج میں بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض شناسی میں مشہور تھے۔ یہ ڈِرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہو کر آتے تھے ڈِرل سکھاتے تھے۔ اس لئے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔ وہ بڑے شہ سوار تھے۔ گھوڑے کو خوب پہچانتے تھے، بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے انہوں نے درست کیے، گھوڑے کے سدھارنے اور پھیرنے میں انہیں کمال تھا۔ چونکہ بدن کی چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے گھڑ دوڑوں میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔ ان کے افسران کی مستعدی، خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے، لیکن کھرے پن سے وہ اکثر اوقات ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے کسی بات پر خفا ہو کر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے انہیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو عام گالی تھی، خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے۔ انہوں نے فوراً رپورٹ کر دی، لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آگے نہ بڑھے مگر خاں صاحب نے ایک نہ سنی۔ معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا، کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خاں صاحب سے معافی مانگے۔ ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی۔ ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفع داری سے آگے نہ بڑھے۔

اچھے بُرے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ شریف افسر خاں صاحب کی سچائی، دیانت اور جفاکشی کی بہت قدر کرتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خنّاس سمایا ہوا تھا۔ انہیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور ہمیشہ ان کے نقصان کے درپے رہتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خودداری کو تو جوہر شرافت سمجھتے ہیں لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا ہے تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول

کرتے ہیں۔ تاہم ان کے بعض انگریز افسر اُن پر بہت مہربان تھے، خاص کر کرنل فرن ٹین اُن پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگو لی چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر تھے ان پر بہت مہربان تھے۔ رسالے کے شریف انگریز اان سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو بہت نقصان پہچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش کیوں کر ہوتے خوشامد سے انہیں چڑتھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے یہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا گھوڑا پکڑو۔ انہوں نے کہا کہ میں سائیس نہیں ہوں۔ اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا، بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا، آخر باگ ایک درخت کی شاخ سے اٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق تھا کہ باگ شاخ میں سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد۔ بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑ وایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی شکایت کی، معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں دیکھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں، وہ بیمار بن گئے اور ہسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپوٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں۔ بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لئے کرسی پر بیٹھ گئے، اور جیب سے سگریٹ دان نکال کر سگریٹ پینا چاہا، دیا سلائی نکال کر سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلام کر

کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگریٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدیداروں کا رنگ فق ہو گیا مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ لہو کے سے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے، بعد میں کچھ لے دے کی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی اس میں چوں چرا کی گنجائش نہ تھی۔ اب اسے اتفاق کہیے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی کے لئے مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ رسالے کے مالیے کی حالت اس زمانہ میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعہ دولت آباد بھی آ گیا۔ اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آ گئے۔

دولت آباد میں کچھ زمین تھی۔ اس میں باغ لگانا شروع کر دیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں بھی آ پہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے۔ مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اُٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے، کہنے لگے آپ کی جان و مال کو دُعا دیتا ہوں۔ اب آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آ گئی، مسٹر واکر نے کہا یہ تو بہت اچھا کام ہے۔ دیکھو تمہارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہوئے ہیں۔ ایک ایک آنے کو بھی ایک ایک انجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہو جائے گی۔ خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کمبخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے۔ تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لیے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑ گل کر گر جاتے ہیں۔ کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرند کھا جاتے ہیں اور پھر ہماری دن رات کی محنت، مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں، تھوڑی ہی دیر میں اور چند ہی باتوں میں آدمی کو ایسا پرکھ لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں ویسا ہی نکلتا ہے۔ کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب ایسے

قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔فوراً ہی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔نواب برزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے۔مقبرے کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ڈاکٹر صاحب نے سفارش کر کے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الونس مقرر کرادیا۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدرآباد چلے گئے،ان کی خدمت کا دوسرا انتظام ہوگیا۔کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب ناظم تعلیمات ہوگئے اور میں ان کی عنایت سے صدر مہتمم تعلیمات ہوکر اورنگ آباد آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرس کر دیا تھا۔میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرر کر دیا، وہ مدرسی اور محرری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرسوں اور محرروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الونس بھی جاری ہوگیا۔

اعلیٰ حضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب وہوا کو بہت پسند فرمایا اور عظیم الشان باغ لگانے کا حکم دیا، یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اور ان سے بہتر کوئی یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو ان کی طبیعت کے مناسب تھی۔اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے۔اور جب تک دم میں دم رہا اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام اور بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں نہیں ہوتیں۔سچائی بات کی اور معاملے کی ان کی سرشت میں تھی۔خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے۔وہ سچ کہنے سے کبھی نہ چوکتے تھے۔اس میں انہیں نقصان بھی اٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔دن ہو، رات ہو، ہر وقت کام کرنے کے لیے تیار۔اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی خوشی کرتے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا، دوستی کے بڑے پکّے اور

بڑے وضعدار تھے۔ چوں کہ ادنیٰ اعلیٰ سب ان کی عزت کرتے تھے اس لئے ان سے غریب دوستوں کے بہت سے کام نکلتے تھے، ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف ان کے گھر پہنچ جاتے اور ان سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آ کر ٹھہر جاتے تھے ان کی بھی دعوت کر دیتے تھے۔ بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں۔ اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر بھی ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خود دار ایسے تھے کہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انہیں خاص اُنس تھا۔ میں کوئی چیز دیتا تو کبھی انکار نہ کرتے بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے۔ مٹھاس کے بیحد شائق تھے۔ ان کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔ وہ کہا کرتے تھے ''نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں'' انہیں مٹھاس کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اکثر جیب میں گُڑ رکھتے تھے، ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے۔ قسم قسم کے پر تکلف کھانے تھے، خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ ایک صاحب دعوت میں شریک تھے یہ خیال کر کے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا ہے کہنے لگے کہ ''حضرت یہ میٹھا ہے'' مگر انہوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے۔ جب وہ ختم ہو گیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ ان صاحب نے پھر ٹوکا ''حضرت یہ میٹھا ہے'' انہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا، جب کبھی وہ کسی دوست کے ہاں جاتے تو وہ انہیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خاں صاحب بہت زندہ دل تھے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی،

وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے،غم اورفکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے۔ اور ہمیشہ خوش رہتے تھےاور دوسروں کوبھی خوش رکھتے تھے۔ان سے ملنےاور باتیں کرنے سےغم غلط ہوتا تھا آخردم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرےاور دل کے کھرے تھے، وہ مہر و وفا کے پُتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے، ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج ومرنجاں اور وضعدار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ان کے بڑھاپے پر جوانوں کورشک آتا تھااوران کی مستعدی کودیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ان کی زندگی بےلوث تھی، اوران کی زندگی کا ہرلمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا، مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہےاور یہ ثبوت ہےاس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔قومیں ایسےہی لوگوں سے بنتی ہیں۔کاش ہم میں بہت سےنورخاں ہوتے۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
سبق آموز	جس سے نصیحت حاصل ہو
نسب	خاندان
امتیاز	فرق
شرفا	شریف کی جمع
توسّط	ذریعہ
شہ سوار	گھڑ سوار
خوش تدبیر	خوش فکر
جفاکش	سخت محنتی
ندارد	غائب
تخفیف	کم کرنا
ذرائع	ذریعہ کی جمع
مستعدی	تیاری، تیار، چستی و پھرتی
عبث	فضول، بے فائدہ، بے کار
محمول	بوجھ لادا ہوا، گمان کیا گیا
معتمد	اعتماد کرنے والا، قابلِ اعتبار
استطاعت	طاقت

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ نور خاں کس رسالے میں سپاہی بھرتی ہوئے تھے؟

۲۔ ''گدڑی کا لال: ''نور خاں'' کے مصنف کا نام لکھیے۔

۳۔ نور خاں کس کو ڈرل سکھاتے تھے؟

مختصر سوالات:

۴۔ نور خاں نے نوکری کیوں چھوڑی تھی؟

۵۔ کون لوگ نور خاں کی قدر کرتے تھے؟

۶۔ دولت آباد قلعہ میں نور خاں اور لارڈ کرزن کے درمیان کون سا واقعہ پیش آیا؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ نور خاں میں کون کون سی اخلاقی خوبیاں تھیں؟ وضاحت کیجیے۔

۸۔ سبق ''گدڑی کا لال ''نور خاں'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ کا تعلق دہلی کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ اُن کی پیدائش ۱۸۸۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے اجداد کا وطن ترکستان تھا۔ لیکن شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں انھوں نے دہلی کو اپنا وطن ثانی بنا لیا، فرحت اللہ بیگ کی تعلیم کی ابتدا گھر پر ہوئی۔ انھوں نے ابتداً عربی، فارسی، اور اُردو پڑھی، بعد ازاں دہلی کے ہندو کالج میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد حیدر آباد (دکن) میں اسٹِنٹ ہوم سیکریٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ یہاں آپ کی ملاقات مولوی عبدالحق سے ہوئی جس کے سبب آپ میں علمی و ادبی جذبہ بیدار ہوا۔ فرحت اللہ بیگ اُردو کے بلند مرتبہ مزاح نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ کے مضامین پانچ حصوں میں ''مضامین، فرحت'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''پھول والوں کی سیر''، ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' اور ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اُن کی شاہ کار تحریروں میں شمار ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کی انفرادی اور مخصوص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے دلّی کی ٹکسالی زبان، محاوروں اور روز مرّہ کا استعمال شوخی، ظرافت، روانی اور بے ساختگی سے کیا ہے۔

سبق ''اُستاد کی تلاش'' مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتاب ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' سے اخذ کیا گیا ہے جس میں انھوں نے اپنے اُستاد مولوی نذیر احمد کا خاکہ کھینچا ہے۔ استادی اور شاگردی کے مقدس رشتے کو جس شگفتہ انداز میں فرحت اللہ بیگ نے پیش کیا ہے اُس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ خاکہ اُستاد کی شفقت اور شاگرد کی فرمانبرداری کا مرقع ہے تو بیجا نہیں ہوگا۔ فرحت اللہ بیگ نے ۱۹۴۷ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

استاد کی تلاش

۱۹۰۳ء میں، میں نے اور میاں دانّی نے ہندو کالج دہلی سے ایف۔اے۔کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ایف۔اے۔میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانّی کا عربی تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی.اے.میں عربی لے لوں، دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی۔ مجھے اپنے حافظے پر گھمنڈ تھا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔ القصہ ہم دونوں بی.اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے۔ بڑے اللہ والے لوگ تھے۔عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوف کی باتوں میں گزر جاتا تھا کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔دانّی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں۔کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔اب رہی صرف ونحو، اس میں تو کورا کا کورا ہی رہا۔سنتے آئے ہیں کہ ''مصیبت کہہ کر نہیں آتی'' لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ ''عربی کے پروفیسر بتا کر نہیں جاتے'' ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفیٰ دے کر کعبۃ اللہ چلے گئے، پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے ان سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں تو انہوں نے کورا جواب دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے۔بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو۔ میں نے دانّی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے ہم نے عربی لی تھی۔اب ہمارے کہنے سے تم سائنس لے لو۔جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا اب اسی سہولت کے مدِ نظر اپنا مضمون بدل لو، بقول شخصے کہ ''مرتا کیا نہ کرتا'' وہ راضی ہو گئے۔

دفتر میں جا کر جو لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔لکچر کم

رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریک امتحان ہونا پڑے گا۔ سنگ آمد و سخت آمد۔ جب ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے'' کی صورت آ پڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ دونوں سر ملا کر بیٹھے، مشورے کئے، رزولیوشن پاس ہوئے، آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ ''خاک از تو دہ کلاں بردار'' کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہئے۔ دلی میں دو تین بڑے عربی دان مانے جاتے تھے، ایک مولوی محمد اسحاق صاحب دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں صاحب، ایل۔ ایل۔ ڈی۔ اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب، پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی۔ اس لئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوتی۔ قرعہ دوسرے صاحب پر پڑا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا، مولوی ضیاء الدین خاں صاحب جامع مسجد دہلی میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیے۔ آٹھ نو بجے، دس بج گئے، مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل، خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک کر خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے۔ ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ اس لئے دروازے میں پہلے قندیل نکلتی نظر آئی۔ اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سرگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک، سفید جبہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں۔

آہستہ آہستہ انہوں نے سیڑھیوں سے اترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے، آخر ذرا تیز قدم چل کر ان کو جا لیا اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فراشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں۔ میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں۔ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ سلام لیتے ہوئے

آگے بڑھے۔اور ہم نے وہی پہلی والی ترکیب کی کہ چکر لگا کر پھر سامنے آ گئے، یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے، پوچھا میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟ رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے، فرمانے لگے، تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں، بہ جنسہ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے جیسے اس زمانے میں کوئی کہے ''تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔آئی۔ڈی۔کا انسپکٹر ہوں'' لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے۔عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں۔فرمانے لگے کہ تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجئے، ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جز و ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو، بہر حال کچھ بھی ہو، انہوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو۔ وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں۔مگر مولوی صاحب کے طرزِ عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنویں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے۔ چلو اس نمبر ۲ پر پانی پھر گیا۔لیکن آئندہ کے لئے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے۔ایسے دشمن کو پکڑنے کے لئے شغال بننا ضروری ہے۔ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور رزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے۔اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا بھی حال سن لیجئے۔ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا۔نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ جوتوں کی دکان تھی۔مولوی نذیر احمد صاحب اس دکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آ کر بیٹھتے تھے۔ عبدالرحمٰن گو میرے ہم جماعت نہ تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا۔مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا۔ چنانچہ انہیں کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔کے امتحانات پاس کیے۔انہی

کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دہلی مین ان کی ٹکڑ کا کوئی وکیل نہیں ہے۔اس زمانے میں یہ ایف۔اے۔میں پڑھتے تھے۔

بہر حال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔دو ایک روز کے بعد ان سے اظہار مطلب کیا۔کہنے لگے کہ بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے۔کہیں انکار نہ کر بیٹھیں۔میں نے کہا کہ میاں عبدالرحمٰن تم ان تک ہم کو پہنچا دو۔اگر ہو سکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت۔وہ راضی ہوگئے اور کہا کہ شام کو آٹھ بجے دکان پر آ جانا مولوی صاحب سے ملوا دوں گا۔اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دکان پر پہنچے یہ دکان فتح پوری کی مسجد کے قریب تھی۔

جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب سراج الدین سے کچھ رقم لے کونے پر بیٹھ گئے۔سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی عبدالرحمٰن ہمارے پاس آ بیٹھے مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انہوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا۔کون گیا۔میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا، دُھتکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔سچ ہے مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے۔مرتا کیا نہ کرتا، میں نے یہی سوچ لیا کہ آج اس پار یا اُس پار۔مولوی ضیاءالدین صاحب تو بچ کر نکل گئے لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔قصہ مختصر، مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ یہ دونوں صاحب کون ہیں۔عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے، کچھ الٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کئے، اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے۔

میں نے دل میں کہا پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ مواکل موا، اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل مرام باضابطہ پسپائی ہو۔میں نے نہایت رقّت آمیز لہجے میں اپنی مصیبت کا تذکرہ کیا، فرمانے لگے تو عربی چھوڑ دو، سائنس پڑھو، بیٹا آج کل

مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے یہاں مثل ہے پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔ فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لوگے عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا۔ان کی اس پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے۔ہم رہنے والے ٹھہرے جامع مسجد کے نیچے کے۔ بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون ور آ سکتا ہے۔ ہم نے ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے اس کے بعد ہنس دیئے، دانی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔ بیٹا جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو، دلی میں کیا مولویوں کا کال ہے، مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔

میں نے عرض کی کہ جناب والا کا اشارہ بالکل صحیح ہے مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں ہیں اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں ہیں۔ کہنے لگے ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمس العلماء مولوی ضیاء الدین صاحب ایل.ایل.ڈی.(یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ ان کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔ میں نے کہا اس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں۔ کہنے لگے میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ، بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہئے، ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصاف حمیدہ و فضائل پسندیدہ سراج الدین کی دکان پر اس طرح معرضِ بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں۔ اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا مگر تم بھاگ جاؤ گے۔ ہم دونوں کے منھ سے ایک ساتھ نکلا، نہیں ہرگز نہیں، مولوی صاحب نے کہا چھٹی ایک دن کی نہ ہوگی۔ ہم نے کہا بہت خوب، مولوی صاحب نے کہا کہ عید بقرعید کو بھی آنا پڑے گا، ہم نے کہا بہت مناسب کل کس وقت حاضر ہوں، مولوی صاحب تھوڑی دیر انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے اس کے بعد کہا دوپہر کو ڈیڑھ بجے۔ ہم نے کہا بہت خوب۔

چونکہ ان باتوں میں رات زیادہ ہوگئی تھی اس لیے مولوی صاحب دکان پر سے اٹھے، ہم نے سلام کیا اور وہ وعلیکم السلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔ یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر اس فیصلے میں بڑی مدد کی۔ ہم دونوں بھی خوش خوش اٹھے اور سلام علیکم وعلیکم السلام کر کے دکان سے چلے۔ راستے میں داؔنی نے کہا۔ میاں مرزا بڑے میاں نے مار ڈالا، بھئی گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے۔ کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں تک آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے۔ دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں چلنے کی تیاری کرنی پڑے گی۔ کہاں چاوڑی اور کہاں کھاری باؤلی۔ جون کا مہینہ، کہیں راستہ میں لُو لگ کر ٹیں نہ ہو جائیں۔ میں نے کہا میاں داؔنی کچھ دنوں چل کر، دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آ جائے۔ مگر ان کو آخر تک رحم نہ آنا تھا نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں مین صبح ساڑھے چھ بجے سے تعلیم کا وقت مقرر ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہی کی ہمت تھی جو وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے۔ بیچاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا۔ اور انہوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا۔ وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔

تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے۔ نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے نہ ان دو سالوں میں ایک دن ناغہ کیا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ بیٹا جب تم دونوں آتے ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے، جس طرح ہم نے پڑھا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس زمانے کو لونڈوں پر اگر ایسی بپتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ مگر (میری طرف دیکھ کر) استاد تم سے مجھے توقع نہیں۔ تم صرف بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو۔ داؔنی کو شوق ہے، یہ عربی میں ترقّی کرے گا مگر تم کورے کے کورے ہی رہو گے اور انشاءاللہ پانچ چھ ہی برس میں میری ساری محنت اکارت کر دو گے۔ خدا کے فضل سے ان کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
حافظہ	یادداشت
خاک ازتودہ کلاں بردار	ذخیرہ سے مطلب کی چیز حاصل کرنا
قندیل	فانوس جس میں چراغ جلاتے ہیں
سفیدریش مبارک	سفید داڑھی
زرد بانات	اونی گرم کپڑا پتلے رنگ کا
سائل	مانگنے والا، پوچھنے والا
قطاع الطریق	رہزن
شغال	گیدڑ
رقّت آمیز لہجہ	نرمی، ملائمت دل بھرنا
سنگ آمد وسخت آمد	امید کے خلاف کام ہونا
قرعہ	پانسہ تانبے پیتل یا جست کا جن کو پھینک کر رمّال غیب کی بات بتاتے ہیں
نالش	دعویٰ
جبّہ	فقیروں کا لباس
وجاہت	عزّت

حلف	قسم کھانا
مضمحل	سُست، ناتواں، کمزور
بے نیل مرام	مراد نہیں پانا
اوصافِ حمیدہ	خوبی تعریف
پڑھیں فارسی بیچیں تیل	فارسی پڑھکر معمولی کام کرتا
فضائل پسندیدہ	عمدہ ہنر

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ سبق ''استاد کی تلاش'' کے مصنف کا کیا نام ہے؟

۲۔ ''ہم عربی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے ہیں''۔ یہ جملہ کس نے کہا؟

۳۔ سبق کے مطابق دلی میں دو تین عربی داں کون مانے جاتے تھے؟

مختصر سوالات:

۴۔ فرحت اللہ بیگ کو عربی پڑھنے کے لیے کن کن دُشواریوں سے گزرنا پڑا؟

۵۔ فرحت اللہ بیگ نے مولوی نذیر احمد تک پہنچنے کے لیے کس کی مدد لی تھی؟

۶۔ مولوی نذیر احمد نے فرحت اللہ بیگ کو پڑھانے کے لیے کون سے اوقات مقرر کیے تھے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ سبق ''اُستاد کی تلاش'' کا خلاصہ اپنی زبانی میں تحریر کیجیے۔

۸۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے طرزِ تحریر پر اظہارِ خیال کیجیے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہین

سوانح نگاری: فن اور روایت

مشرق و مغرب کے بیش تر مفکرین نے سوانح نگاری (سیرت نگاری) کو تاریخ کی شاخ قرار دیا ہے۔ کارلائل کے مطابق سوانح ''فرد کی داستانِ حیات ہے'' تو ایمرسن کا خیال ہے کہ ''جب کوئی عظیم انسان کسی عظیم انسان کی زندگی کی تشریح کرتا ہے تو سوانح عمری وجود میں آتی ہے۔'' خاکہ نگاری کی طرح سوانح نگاری میں شخصیت اور واقعات کا انتخاب، ترتیب و پیش کش اور مُنصفانہ اندازِ تحریر کے ذریعہ مثبت نتائج نکالنے جیسے اہم نکات سے سوانح نگار کو رُوبرو ہونا پڑتا ہے۔ اہل عرب و عجم نے سوانح نگاری و سیرت نگاری پر خصوصی توجہ صرف کی۔ اس کا ثبوت اس طرح فراہم ہوتا ہے کہ اکثر صاحبِ قلم نے حضور اکرم ﷺ اور بعض مُحدّثین کے حالات اور سوانحی کوائف کو سلسلے وار لکھنے کا مقدس فریضہ بہ حُسن و خوبی انجام دیا۔ رفتہ رفتہ سوانح و سیرت نگاری ادب کا حصہ بن گئی۔ سوانح کے مختلف اقسام میں سیرت نگاری کے علاوہ خودنوشت، سرگذشت، یادنگاری اور آپ بیتی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ آخرالذّکر چاروں اقسام وہ ہیں جن میں اہل قلم یا مصنف اپنے حالات تحریر کرتا ہے، سوانح نگار کو غیر جانب داری سے کام لینا چاہیے، لیکن بہت کم سوانح نگار اس کسوٹی پر کھرے اُترتے ہیں اسی لیے بہت سی سوانح عمریوں میں جانب داری، بیجا تنقیص، متعصّبانہ اندازِ بیان اور غیر ضروری امور کا تذکرہ بارِ گراں معلوم ہوتا ہے۔

اردو میں بعض اصناف اور رجحانات کی طرح سوانح نگاری کی ابتداء بھی شعرائے اردو کے تذکروں سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ حالؔی سے قبل سراج الدین نامی ایک شخص نے اردو میں سوانح نگاری کا

تفصیلی نمونہ پیش کیا تھا،لیکن صحیح معنوں میں حالؔی اور شبلؔی نے اردو سوانح نگاری کو بام عروج پر پہنچایا۔حالؔی نے ''یادگار غالبؔ''،''حیات سعدیؔ'' اور ''حیاتِ جاوید'' جیسی سوانح عمریاں لکھ کر سوانح نگاری کو بال و پر عطا کیے تو شبلؔی نعمانی نے ''المامون''،''الفاروق''،''الغزالی''،''النعمان''،''سیرۃ النبی'' اور ''سوانح مولانا رومؔ'' جیسی سوانح عمریاں سپردِ قلم کر کے سوانحی ادب کو نیے رنگ و آہنگ سے رُوشناس کرایا اسی طرح ''شعر العجم'' میں انھوں نے فارسی شعراء و ادباء کے سوانحی کوائف لکھ کر نہ صرف اسے دستاویزی حیثیت عطا کی بلکہ حالؔی کی طرح سوانح نگاری کو معراج کمال بخشنے کی کامیاب کوشش کی۔مولانا محمد حسین آزادؔ کی ''آبِ حیات'' اور ''سخندانِ فارس'' سوانح نگاری کی تاریخ میں اہم کارنامہ تسلیم کی جاتی ہیں۔

حالؔی ،شبلؔی اور آزادؔ کی پیروی کرتے ہوئے بہت سے مصنفین نے مختلف شخصیات سے متعلق سوانحی کتابیں تحریر کیں، جن میں وحیدالدین سلیمؔ کی ''ایک وصیّت کی تکمیل''، غلام رسول مہرؔ کی ''مرزا غالبؔ''، عبدالغفار کی ''حکیم اجمل خاں''، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی ''ماسٹر رام چندر''، ڈاکٹر خلیق انجمؔ کی ''مرزا محمد رفیع سوداؔ'' اور پرفیسر جگن ناتھ آزادؔ کی ''محمد اقبال: ایک ادبی سوانح'' وغیرہ کی سوانحی ادب میں غیر معمولی اہمیت ہے۔

خودنوشت ،سرگذشت ،آپ بیتی اور یادنگاری کا سلسلہ بھی اردو میں سوانح اور سیرت نگاری کے دوش بدوش چلتا رہا تاہم چند ایسی کتابیں ضابطۂ تحریر میں آئیں جن کی علمی، ادبی اور تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔اس قبیل کی کتابوں کا سلسلہ ''کالا پانی'' (جعفر تھانیشری) اور ''داستان غدر'' (ظہیرؔ دہلوی) سے شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ''اعمال نامہ'' (سر رضا علی) ''خودنوشت'' (خواجہ حسن نظامی) ''نقشِ حیات'' (مولانا حسین مدنی) ''تذکرہ'' (ابو الکلام آزادؔ) ''ناقابلِ فراموش'' (دیوان سنگھ مفتوںؔ) ''یادوں کی دنیا'' (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) ''یادوں کی برات'' (جوشؔ ملیح آبادی) ''یادوں کا جشن'' (کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ) ''خواب باقی ہیں'' (پروفیسر آلِ احمد سرورؔ) ''روشنائی'' (سجّاد ظہیر) ''اس آباد

خرابے میں'' (اختر الایمان) ''میرے گذشتہ روز شب'' (جگن ناتھ آزاد) ''شہاب نامہ'' (قدرت اللہ شہابؔ) ''منزلیں گرد کے مانند'' (خلیق ابراہیم خلیقؔ) ''ہم سفر'' (سلیم اختر) ''جو رہی سو بے خبری رہی (ادا جعفری) ''ڈگر سے ہٹ کر'' (سعیدہ بانو احمد) اور ''گردشِ پا'' (زبیرؔ رضوی) جیسی کتابیں وجود میں آئیں جن کے سبب اُردو کا سوانحی ادب مالا مال ہوا۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالؔی کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں محلّہ انصاریان پانی پت میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام ایزد بخش انصاری تھا، جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ محض نو برس کی معمولی عمر میں حالؔی کے والد کا انتقال ہوگیا۔ جس سے انھیں مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑے بھائی اور بہن نے حالؔی کی سرپرستی کی۔ قرآنِ مجید حفظ کرنے کے بعد عربی و فارسی پڑھی۔ دورانِ طالبِ علمی حالی کی مرضی کے خلاف اُن کی شادی کردی گئی جس کے سبب وہ ناراض ہوکر دہلی چلے گیے۔ یہاں انھوں نے مولوی نوازش علی کی شاگردی میں عربی کی تعلیم مکمل کی ساتھ ہی علم منطق اور علم عروض سیکھا۔ اُسی زمانے میں آپ کی ملاقات مرزا اسداللہ خاں غالبؔ سے ہوئی۔ حالی نے دہلی میں غالب کی شاگردی قبول کی اور مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں آپ نے حصار کے محکمۂ کلکٹری میں نوکری شروع کی۔ کچھ سالوں بعد دوبارہ دہلی تشریف لے آئے اور تقریباً آٹھ برس تک شیفتہؔ کے بچوں کے معلم مقرر رہے بعد ازاں گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کی۔ پھر دہلی کے ایک اسکول میں ملازم ہوئے۔ یہاں سرسید سے ملاقات ہوئی۔ حالؔی کو ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اور ۳۱/ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ۷۰ برس کی عمر میں بمقام دہلی اُن کا انتقال ہوگیا۔

حالؔی باکمال شاعر اور قابلِ قدر نثر نگار کی حیثیت سے اُردو ادب میں انفرادی پہچان رکھتے ہیں۔ سوانح نگاری میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

سبق ''غالبؔ کے اخلاق و عادات'' حالؔی کی سوانحی کتاب ''یادگارِ غالبؔ'' کا حصّہ ہے۔ حالؔی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ غالبؔ کے اخلاق وسیع تھے۔ وہ علم دوست اور ادب نواز شخص تھے۔ اپنے دوست

احباب پر ہمیشہ مہربانی فرماتے تھے۔ غالبؔ کی پسند ناپسند، محرومی، کامیابی وغیرہ کا ذکر جا بجا اس کتاب میں ملتا ہے۔ غالبؔ کی آمدنی اور خودّداری کا ذکر حالیؔ نے صاف گوئی سے کیا ہے اور غالبؔ کی انسان دوستی کی تعریف بجا طور پر کی ہے۔ غالبؔ نے ہمیشہ اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کی۔ حالیؔ کی یہ تحریر اُردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

غالبؔ کے اخلاق و عادات

مرزا غالبؔ کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا۔ بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا، اُس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا، دوستوں کو دیکھ کر، وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غم گین ہوتے تھے۔ اِس لیے اُن کے دوست، ہر ملت اور ہر مذہب کے، نہ صرف دلی میں، بلکہ تمام ہندستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے مہر و محبت اور غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمہ فرض عین سمجھتے تھے، اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا، بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں، اُن کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے، لوگ اکثر بے رنگ خطوط بھیجتے تھے۔ مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا، تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مروّت اور لحاظ، مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا، باوجودے کہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ بہ ایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک ہو سکا، احباب کی خدمت بجالایا، اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا اور اصلاح دیتا تھا، اب آنکھوں سے اچھی طرح سوجھے

نہ ہاتھ سے لکھا جائے۔''

اگر چہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد وعورت، ہر وقت پڑے رہتے تھے، غدر کے بعد اُن کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہ وار کی ہوگئی تھی اور کھانے پہننے کا خرچ بھی لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے، غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لیفٹنٹ گورنر کے دربار میں، ان کو حسبِ معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لیفٹننٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا، اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھی۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی، تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب، جو مرزا کے دلی دوست تھے، غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہوگئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے ملنے کو آئے، مرزا نے کبھی انھیں مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغّوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اِس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے چھینٹ منگوا دیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور اسی وقت میں نے اسے پہنا ہے اگر آپ کو پسند ہے، تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا، جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں، مگر جاڑا شدّت کا پڑ رہا ہے، آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا چُغہ اتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اس خوب صورتی کے ساتھ

وہ پُغہ ان کی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قلندری وآزادگی وایثار وکرم کے جو دواعی، میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بہ قدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں، اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کا لٹکا لوں، اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ، کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم کا نہ ہو سکے، نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اُس شہر میں تو کوئی بھوکا، ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملاتِ کلام وکمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بہ در بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔

جیسی مرزا کی طبیعت میں درّاکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ اشتقال تھی، اُسی طرح اُن کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا، اُن کے گھر میں کتاب کا نشان نہ تھا ہمیشہ کرائے پر کتابیں منگوا لیتے تھے اور اُنھیں دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے، مگر جو لطف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی، اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام مین وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے، جس کی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی ''بادِ مخالف'' لکھی تھی، اُنھیں مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے علاحدہ لکھ کر بھیجی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں مفصل

بیان کیا ہے۔ ''برہان قاطع'' پر جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہوتا تھا، تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے، اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہین لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے، شعر فہمی اور کتاب فہمی میں بھی وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مضمون ہو، ایک سرسری نظر میں اُس کی تہہ کو پہنچ جاتے تھے۔

مرزا کی تقریر میں، اُن کی تحریر اور اُن کی نظم ونثر سے کچھ لُطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا، لطف سے خالی نہ ہوتا تھا، ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بہ جائے حیوانِ ناطق کے، حیوانِ ظریف کہا جائے تو بہ جا ہے حُسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا، اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا، تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا ''مرزا! تم نے کتنے روزے رکھے؟'' ''عرض کیا'' پیر ومرشد! ایک نہیں رکھا۔

ایک دن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان پر ملنے کو آئے۔ اُن کے مکان کے آگے چھتّہ بہت تاریک تھا، جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب اُن کو لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے انہیں دیکھ کر یہ مصرع پڑھا۔

کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکیست

جب دیوان خانے میں پہنچے، تو اُس کے دالان میں، بہ سببِ شرق رو یہ ہونے کے، دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا

ایں خانہ تمام آفتاب است

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر اٹھتے بیٹھتے تھے۔ وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا دروازہ اِس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جُھک کر جانا پڑتا تھا۔ اُس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے مہینے میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ تھا اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اُس حدیث کی صحت میں تردّد پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا، قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، یہی کوٹھری تو ہے۔''

الغرض مرزا کی کوئی بات لُطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی اُن کے تمام ملفوظات جمع کرتا، تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
کُشادہ پیشانی	خوش اخلاقی، خندہ پیشانی
اشتیاق	شوق، آرزو، تمنا
یگانگت	قرابت، اتفاق، اتحاد
قلیل	ذراسا، تھوڑا، کم، کوتاہ
حسبِ معمول	دستور کے مطابق
خلعت	وہ پوشاک جو بادشاہ یا اُمراء کی طرف سے بطور عزت افزائی ملے۔
سِقیم	بیمار، خراب، خستہ، ابتر
فرغل	رُوئی دار لبادہ
جودت	ذہانت، لیاقت، ذکاوت
سُرعت	جلدی، تیزی، پُھرتی
اساتذہ	اُستاد کی جمع
مشتاق	آرزومند، طالب، خواہش مند
تاریک	اندھیرا، کالا، سیاہ
چوسَر	شطرنج یعنی ایک کھیل کا نام
مُقید	قیدی، اسیر، پابند

ظرافت	دل لگی، مذاق، تمسخر
ملفوظات	پڑھا گیا، مُنھ سے بولی ہوئی بات
ضخیم	بہت بڑا، موٹا
لطائف وظرائف	لطیفہ اور ظرافت کی جمع

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ ''غالبؔ کے اخلاق و عادات'' کا مصنف کون ہے؟

۲۔ مصنف کے مطابق کس کے اخلاق نہایت وسیع تھے؟

۳۔ مصنف کے مطابق کون اپنے ملنے والوں سے ''کشادہ پیشانی سے ملتے تھے''؟

مختصر سوالات:

۴۔ حالیؔ کے مطابق کون ''دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے''؟

۵۔ جب رمضان گزر جانے پر غالبؔ لال قلعے میں گیے تو بادشاہ نے اُن سے کیا پوچھا اور غالب نے کیا جواب دیا؟

۶۔ غالبؔ نے مثنوی ''بادِ مخالف'' کیوں لکھی تھی؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ سبق ''غالبؔ کے اخلاق و عادات'' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

۸۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی نثر نگاری پر اظہارِ خیال کیجیے۔

علاّمہ شبلی نعمانی

علاّمہ شبلی نعمانی کی ولادت ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔آپ کے والد شیخ حبیب اللہ کا شمار اپنے عہد کے مشہور اور کامیاب وکیلوں میں ہوتا تھا۔ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد شبلی نے اپنے وقت کے علماء مولوی شکر اللہ اور محمد فاروق چریا کوٹی، ہیڈ مولوی غازی پور سے عربی ادب، معقولات اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ شبلی کے والد خود وکیل تھے اس لیے والد کے حکم کی تعمیل میں انھوں وکالت کا امتحان تو پاس کرلیا لیکن اس پیشے میں اُنکی دل چسپی نہیں تھی۔لہٰذا سرکاری ملازم ہوگئے اور امین دیوانی کے عہدہ پر تھوڑے عرصے کام کر کے استعفیٰ دے دیا کم عمری میں حج بیت اللہ کی دولت سے سرفراز ہوئے، سرسید کی فرمائش پر علی گڑھ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ یہاں سرسید اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔شبلی کو سیر وسیاحت کا بہت شوق تھا اس لیے انھوں نے مصر، روم، شام اور ترکی جیسے اسلامی ممالک کا سفر کیا۔۱۸۹۴ء میں انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔اسی سال آپ نے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء اور ۱۹۱۳ء میں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) قائم کیا۔۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اُردو نثر ونظم کے ذریعہ اپنی خدمات انجام دیں۔''شعرالعجم'' اور ''موازنۂ انیس ودبیر'' آپکی تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی تصانیف ہیں۔اس کے علاوہ ''المامون'' ''الفاروق''، ''الغزالی''، سیرۃ النبی اور ''سوانح مولانا رومؔ'' آپکی قابلِ قدر سوانحی تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔زیرِ نظر مضمون ''مامون کا فضل وکمال اور عام اخلاق وعادات'' علاّمہ شبلی نعمانی کی سوانح تصنیف ''المامون'' سے

ماخوذ ہے۔ مامون الرشید کا شمار اپنے عہد کی ممتاز شخصیات میں ہوتا تھا۔شبلی نے مامون کے اخلاق و عادات اور سیرت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مامون کی خدمات اور غیر معمولی کارناموں پر اس سے پہلے کسی مصنف نے اِس قدر زور ِ بیان نہیں دکھایا۔شبلی کی عالمانہ نثر کا بغور مطالعہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ علاّمہ کا اُسلوبِ نگارش مامون الرشید کی شخصیت کے شایانِ شان ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ مامون کی سیرت پر لکھ کر علاّمہ شبلی نے سوانح اور تاریخ نگاری کو نیا افق عطا کیا تو زیادہ درست ہوگا۔

علاّمہ شبلی نعمانی

مامُون کا فضل وکمال اور عام اخلاق وعادات

اسلام کو آج تیرہ سو برس سے کچھ اوپر ہوئے۔ اس وسیع مدّت میں ایک تخت نشین بھی ایسا نہیں گزرا جو فضل وکمال کے اعتبار سے مامون کی یکتائی کا حریف ہوسکتا۔ افسوس ہے کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفاء وسلاطین کے پہلو میں جگہ دی ورنہ شاعری، ایام العرب، ادب، فقہ، فلسفہ کون سی بزم ہے جہاں فخر وشرف کے ساتھ اس کا استقبال نہ کیا جاتا۔ قریباً پانچ برس کی عمر میں وہ مکتب میں بٹھایا گیا۔ علماء جو اس کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے ہر ایک یگانۂ وقت تھا۔

مامون کے اساتذہ اور طالب العلمی کے حالات کو اس موقعہ پر ہم دہرانا نہیں چاہتے، ذیل کی حکایتوں سے جو نہایت صحیح اور مستند تاریخی شہادتوں سے ثابت ہیں۔ مامون کی جامعیت اور فضل وکمال کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک بار ایک شخص مامون کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ محدث ہوں اور اسی فن میں کل زندگی بسر کردی ہے، مامون نے کہا اس مسئلہ کے متعلق کتنی حدیثیں یاد ہیں؟ وہ ایک بھی نہ بتا سکا۔ مامون نے بیسوں روایتیں بیان کیں اور سندوں کا ایک تار باندھ دیا کہ اس باب میں ہشیم نے یہ کہا ہے، حجاج نے یہ روایت کی ہے۔ ایک دوسرے محدث کا یہ قول ہے۔ پھر اس شخص سے ایک دوسرا مسئلہ پوچھا۔ وہ اب بھی عاجز رہا، مامون نے اسی طرح حدیث کے متعدد طریقے بیان کیے اور درباریوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ لوگ تین دن حدیث پڑھکر پھول جاتے ہیں کہ ہم بھی محدث ہیں، خیر تین درہم اس کو دلاؤ۔ ادب وشاعری میں وہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ بڑے بڑے ماہرین فن اس کی استادی کا اعتراف کرتے تھے۔ قدما اور شعرائے جاہلیت کے علاوہ شعرائے عصر کے مشہور قصائد اور قطعے اس کو نوک زبان یاد تھے اور اس باب میں اس کی شہرت ضرب المثل کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ علاّمہ یزیدی نے کہا ''ہاں'' مامون نے

ادب میں نجوم اورطب اور منطق کو بھی ملا دیا تھا لیکن واثق نے ادب کے سوا اور کسی فن کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ مامون کو اس ذوق وشوق میں شان سلطنت کا بھی خیال نہ تھا، خود اس کی ہجو میں وعبل وغیرہ نے جو لکھا تھا اس کو حفظ یاد تھا اور زبان کی شستگی کے لحاظ سے اس کی تحسین کرتا تھا۔ خدا نے طبیعت ایسی موزوں اور طبّاع عطا کی تھی کہ شعرا اس کی زود فہمی اور نکتہ سنجی پر حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر جب عمارہ بن عقیل نے سو شعروں کا ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا تو ہر شعر پر مصرعۂ ثانی کے شروع ہونے سے پہلے مامون بتا تا گیا کہ یہ قافیہ ہے اور اس پہلو سے بندھا ہوگا۔ عمارہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ خدا گواہ ہے اب تک اس قصیدہ کا ایک شعر بھی میں نے ظاہر نہیں کیا ہے۔ مامون نے کہا تم کو معلوم ہوگا کہ جب عبداللہ بن عباس کے سامنے ایک شاعر نے اپنا لکھا ہوا قصیدہ پڑھا تو وہ برابر دوسرا مصرعہ پڑھتے گئے، میں انھیں کا فرزند ہوں۔ مامون کی خوش بیانی اور برجستہ گوئی کا عموماً لوگ اعتراف کرتے ہیں، ثمامہ بن اشرس کا قول ہے کہ میں نے جعفر برمکی اور مامون سے زیادہ فصیح وبلیغ کسی کو نہیں دیکھا۔

ایک بار عید کے دن مامون کے خوان کرم پر بہت سے معزز مہمان جمع تھے۔ تین سو سے زائد مختلف اقسام کے کھانے دستر خوان پر چنے گئے۔ مامون ہر ایک کا خاصہ اور اثر بتا تا جاتا تھا کہ بلغمی مزاج کو یہ مفید ہے، سودادی کو وہ نافع ہے جس کو صفرا کا زور ہو وہ اس قسم سے پرہیز کرے، جو ثقیل غذا کا عادی ہے وہ یہ کھائے، مامون کی ہمہ دانی پر تمام حاضرین محو حیرت تھے۔ قاضی یحییٰ بن اکثم سے نہ رہا گیا، بے ساختہ بول اٹھے کہ امیر المومنین آپ کی کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ طب کا ذکر ہو تو آپ جالینوس وقت ہیں، نجوم کی بات چھڑے تو ہرمس، فقہ کی بحث ہو تو علی مرتضیٰ سخاوت میں حاتم، راست بیانی میں ابوذر، وفا میں سمول۔ اس سچی خوشامد سے مامون بھی پھڑک اٹھا اور کہا کہ ہاں آدمی کو جو شرف ہے وہ عقل سے ہے ورنہ خون اور گوشت میں کیا خوبی رکھی ہے۔

مامون کے بعض دلآویز اقوال اس موقعہ پر نقل کرنا موزوں ہوگا جن سے اس کے لطیف اور اعلیٰ

وفیاضانہ خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کا قول تھا کہ شریف وہ ہے جو بڑوں کو دبالے اور چھوٹوں سے خود دبے۔عقلوں کی لڑائی دیکھنے سے دنیا میں کوئی تماشہ عمدہ نہیں۔دلیل سے غالب ہونا، میں بہ نسبت زور سے غالب ہونے کے زیادہ پسند کرتا ہوں۔آدمی تین قسم کے ہیں۔بعض ایسے ہیں جن کی ہر وقت ضرورت ہے۔بعض بہ منزلہ دوا کے ہیں کہ خاص وقتوں میں ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بعض تو ایسے ہیں کہ بیماری کی طرح کسی حال میں پسندیدہ نہیں۔بادشاہ کو لجاجت نہایت نازیبا ہے اور اس سے زیادہ یہ نازیبا ہے کہ قاضی فریقین کی تسکین نہ کرے اور گھبرا جائے اور ان سب سے زیادہ ناموزوں بوڑھوں کی ظرافت، جوانوں کی کاہلی، سپاہی کی بزدلی ہے، سب سے عمدہ مجلس وہ ہے جس میں لوگوں کے حالات سے واقفیت ہو۔مامون شطرنج کا بڑا شایق تھا مگر اچھی نہیں کھیلتا تھا۔اکثر کہا کرتا تھا کہ عرصۂ عالم کا بندو بست کرتا ہوں، مگر دو بالشت کا انتظام نہیں کرسکتا۔مامون کی نسبت مورخین کے متفقہ الفاظ یہ ہیں کہ تمام خلفائے بنی عباس میں کوئی تخت نشین دانائی، عزم بردباری، علم، رائے، تدبیر، ہیبت، شجاعت عالی حوصلگی، فیاضی میں اس سے افضل نہیں گذرا۔

ہارون رشید اکثر کہا کرتا تھا کہ ''میں مامون میں منصور کا جزم، مہدی کی خداپرستی، ہادی کی شان وشوکت پاتا ہوں'' ان باتوں پر اگر اس کے عفوو انکسار، بے تکلفی، سادہ مزاجی کی صفتیں بڑھائی جائیں تو افضلیت کا دائرہ جس کو مورخین نے بنی عباس تک محدود کیا تھا، تمام سلاطین اسلام کو محدود ہو جاتا ہے۔

مامون کا قول تھا کہ ''مجھ کو عفو میں ایسا مزا آتا ہے کہ اس پر ثواب ملنے کی توقع نہیں''۔عبداللہ بن طاہر کا بیان ہے کہ ایک بار مامون کی خدمت میں میں حاضر تھا۔اس نے غلام کو آواز دی مگر صدائے بر نخاست۔پھر پکارا تو ایک ترکی غلام حاضر ہوا اور آتے ہی بڑبڑانے لگا کہ کیا غلام کھاتے پیتے نہیں، جب ذرا کسی کام کے لیے باہر گئے تو آپ ''یا غلام یا غلام'' چلانے لگتے ہیں۔آخر یا غلام کی کوئی حد بھی ہے۔مامون نے سر جھکا لیا اور دیر تک سر بگریبان رہا۔میں نے سمجھا کہ بس اب غلام کی خیر نہیں۔مامون میری

طرف مخاطب ہوااور کہا کہ نیک مزاجی بھی بُری آفت ہے کہ نوکراور غلام شریراور بدخو ہو جاتے ہیں مگر یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ان کے نیک کرنے کے لیے میں بدمزاج بنوں۔

ایک دن دجلہ کے کنارے بیٹھا تھا۔ارکان دولت دست بستہ کھڑے تھے سامنے پردہ پڑا ہوا تھا۔ایک ملاح یہ کہتا ہوا جاتا تھا کہ ''مامون جس نے اپنے بھائی کوقتل کردیا کیا ہماری آنکھ میں عزت حاصل کرسکتا ہے'' مامون یہ سن کرمسکرادیااورارکان دولت کی طرف مخاطب ہوکرکہا۔کیوں صاحبو! آپ ایسی بھی کوئی تدبیر بتاسکتے ہیں کہ میں اس جلیل القدرآدمی کی نظروں میں موقر ہوسکوں؟

اس غیرمعتدل رحم پر جو بظاہر شانِ خلافت کے شایانِ شان نہ تھا مامون کو ناز تھا۔وہ فخر سے کہتا تھا کہ خواص وخدام اکثر اپنے جلسوں میں بیٹھ کر مجھ کوگالیاں دیتے ہیں اور میں خود اپنے کانوں سے سن کر دانستہ اغماض کرتا ہوں۔

حسین بن ضحاک ایک شاعر نے جوامین کا ندیم تھا،امین کے قتل کا نہایت جاں گداز مرثیہ لکھا جس میں مامون کو بہت کچھ برا بھلا کہہ کر دل کے پھپھولے پھوڑے تھے، مامون نے یہ اشعار سنے تو صرف یہ حکم دیا کہ شاعروں کے ساتھ دربار میں نہ آئے۔چندروز بعد پھر بلایا اور کہا، سچ کہنا بھائی امین کے قتل اور بغداد کی فتح کے دن تو نے کسی ہاشمی عورت کو مارے جاتے اور ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔حسین نے کہا کسی کونہیں۔مامون نے اس کے الزام دینے کواس کے چنداشعار پڑھ کرسنائے جس میں اس نے نہایت دردانگیز لفظوں میں یہ سماں کھینچا تھا کہ بغداد تباہ کیا جارہا ہےاورآل ہاشم کی نازک اورگل اندام عورتیں غارت گروں کے بے رحم ہاتھ سے اپنے ناموس کونہیں بچاسکتیں،حسین نے کہا۔اے امیرالمومنین یہ ایک جوش تھا جس کو میں دبا نہ سکا۔امین کے غم میں صحیح اور غلط کی کس کوتمیز تھی۔خلیفہ مرحوم کا ماتم جن لفظوں میں ہوسکا ادا ہوا۔اگرتو مواخذہ کرے تو تجھ کوحق ہےاور بخش دے تو تیری فیاضی ہے۔مامون کی آنکھوں میں آنسوبھرآئے اورحکم ہوا کہ اس کی تنخواہ بحال کردی جائے۔

مامون کا دعویٰ تھا کہ بڑے سے بڑا جرم بھی میرے حلم کو متزلزل نہیں کرسکتا۔ ایک شخص سے جو متعدد بار نافرمانیاں کر چکا تھا اس نے کہا کہ تو جس قدر گناہ کرتا جائے گا۔ میں بخشتا جاؤں گا یہاں تک کہ آخر عفو تجھ کو تھکا کر درست کر دے گا۔ مامون کی اس رحم دلی پر لوگوں کو اس قدر بھروسہ ہو گیا تھا کہ بے تکلف اس کے سامنے اپنی خطاؤں کا اعتراف کر دیتے تھے۔

مامون اگر چہ بڑی عظمت و شان کا بادشاہ تھا اور ناموری کے دفتر میں عام مورخین نے اس کے جاہ و جلال کی داستانیں جلی خط سے لکھی ہیں مگر ہمارے خیال میں جو چیز اس کی تاریخ زندگی کو نہایت مزین اور پر اثر بنا دیتی ہے وہ اس کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی ہے۔ ایک ایسا شہنشاہ جو تخت حکومت پر بیٹھ کر کل اسلامی دنیا کا ذمہ دار بن جاتا ہے، کس قدر عجیب بات ہے کہ عام دوستوں سے ملنے جلنے میں شانِ سلطنت کا لحاظ رکھنا بالکل پسند نہیں کرتا۔ اکثر اہل علم و ارباب کمال راتوں کو اس کے مہمان ہوتے تھے اور اس کے بستر سے بستر لگا کر سوتے تھے مگر اس کا عام برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ ایک سادہ خالص دوست کا دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ قاضی یحییٰ ایک رات اس کے مہمان تھے۔ اتفاقاً آدھی رات کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اور پیاس معلوم ہوئی۔ چوں کہ چہرہ سے بیتابی کا اثر ظاہر ہوتا تھا۔ مامون نے پوچھا خیر ہے؟ قاضی صاحب نے پیاس کی شکایت کی۔ مامون خود چلا گیا اور دوسرے کمرے سے پانی کی صراحی اٹھا لایا۔ قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا حضور نے خدام کو ارشاد کیا ہوتا۔ مامون نے کہا۔ نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''سید القوم خادمہم'' راتوں کو خدام سو جاتے تھے تو خود اٹھ کر چراغ اور شمعیں درست کر دیا کرتا تھا۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
وسیع	کشادہ، پھیلا ہوا
حریف	بدخواہ، دشمن، چالاک
یگانۂ وقت	اپنے عہد میں بے مثل، بے نظیر، لاثانی
مُستند	سند یافتہ، تصدیق شدہ
جامعیت	ہمہ گیری، کاملیّت
مُحدّث	علم حدیث کا جاننے والا، فقیہ
حجاج	حاجی لوگ، حاجی کی جمع
متعدّد	گنے ہوئے، چند، متفرق
عصر	وقت، زمانہ عہد، دَور
طبّاع	غیر معمولی، ذہین، تیز طبیعت
زود فہمی	تیز فہمی، ہوشیاری، ذکاوت
نکتہ سنجی	خوش گفتاری، خوش بیانی
اعتراف	اقرار کرنا، تسلیم کرنا
ثقیل	بھاری، بوجھل
شائق	شوقین، مشتاق، آرزومند

شجاعت	بہادری، دلیری
محدود	باندھا ہوا، روکا ہوا، جس کی حد مقرر ہو
توقّع	اُمید، بھروسہ
غیر معتدل	غیر موافق، جس میں اعتدال نہ ہو
دانستہ	جانا پہچانا ہوا، جان بوجھ کر
مواخذہ	جواب طلبی، گرفت، باز پُرس
متزلزل	کانپنے والا، لرزاں، ڈگمگانے والا

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ سبق ''مامون کا فضل وکمال اور عام اخلاق وعادات'' کے مصنف کا نام بتایئے؟

۲۔ سبق کے مطابق ''عظمت وشان کا بادشاہ'' کسے کہا گیا ہے؟

۳۔ مامون کس دریا کے کنارے بیٹھا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ سبق کے مطابق مامون کا کیا دعویٰ تھا؟

۵۔ محدّث سے مامون نے کیا سوالات کیے؟

۶۔ ہارون رشید نے مامون کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا تھا؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ سبق ''مامون کا فضل وکمال اور عام اخلاق وعادات'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں سُپردِ قلم کیجیے۔

۸۔ علاّمہ شبلی نعمانی کے سوانح اور نثری خدمات پر روشنی ڈالیے۔

خطوط نویسی

گوآج موبائل فون کے چلن نے خطوط نگاری کے رواج کو ختم سا کر دیا ہے۔مگر ان کی ادبی حیثیت آج بھی مسلّم ہے۔خطوط ہماری زندگی کا جز ہیں انکے ذریعہ ہم اپنے عزیز واقارب، دوست، احباب کی نہ صرف خیر و عافیت معلوم کرتے ہیں بلکہ نصف ملاقات کا لطف بھی اُٹھاتے ہیں۔خط لکھنے والے کو کاتب اور جس کو خط لکھا جاتا ہے اُسے مکتوب اِلیہ کہتے ہیں۔خطوط نویسی کے دو طریقے ہیں پہلا قدیم طریقہ۔اس طریقے میں لمبے لمبے القاب وآداب اور تصنع آمیز الفاظ،فقرے اور جملے استعمال کئے جاتے تھے۔عبارت نہایت مقفّٰی اور مسجّع لکھی جاتی تھی مگر اب خطوط نویسی کا یہ طریقہ متروک سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا خطوط نگاری کا طریقہ جدید ہے جو آجکل رائج ہے۔اس طریقہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں القاب وآداب مختصر،عبارت عام فہم اور سلیس استعمال کی جاتی ہے،تمہید اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

خطوط نجی،کاروباری اور سرکاری تین طرح کے ہوتے ہیں۔ان سبھی طرح کے خطوط میں درجِ ذیل باتوں کو دھیان میں رکھنا چاہئے:

(۱) کاتب کا مختصر پتہ وتاریخ (۲) القاب

(۳) آداب (۴) مضمونِ خط

(۵) خاتمہ (۶) مکتوب اِلیہ کا نام و پتہ

مضمون نویسی

انشاء پردازی یا مضمون نگاری ایک آرٹ یا فن ہے جس مین کسی عنوان پر اپنے خیالات کو پُر اثر، عمدہ اور مناسب انداز میں لکھا جاتا ہے۔ مضمون نگاری میں خیالات کا ایک مسلسل اور مربوط سلسلہ ہوتا ہے۔

جب کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے ذہن اور دل میں کوئی بات آتی ہے۔ یہی اس کا خیال ہے، اس خیال کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ ذہن و دل میں پہلے خیالات آتے ہیں اسکے بعد ان خیالات کے اظہار کے لیے لفظوں کی تلاش ہوتی ہے۔ خیالات اصل ہیں اور الفاظ خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ خیالات کا اثر دیرپا ہوتا ہے اور الفاظ کا وقتی، اس لیے مضمون نگار کو زیادہ زور اور توجہ خیالات کی اصلاح اور پاکیزگی کی طرف دینا چاہیے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خیالات اور الفاظ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ بات بھی مناسب اور پسندیدہ نہیں کہ خیالات تو عمدہ اور بلند ہوں مگر ان کو پست اور بھونڈے لفظوں میں بیان کیا جائے اور یہ بھی نہ ہو کہ ساری توجہ اور لیاقت الفاظ کی تلاش اور انتخاب میں صرف کر دی جائے اور خیالات کی طرف کم توجہ دی جائے ایسا کرنے سے خیالات اور الفاظ میں مطلوبہ اور پسندیدہ تعلق اور تناسب نہیں رہ جاتا اور مضمون کی حیثیت گر جاتی ہے اور اس میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔

مضمون نگار کی زبان میں جب تک لوچ، روزمرّہ میں صفائی، ترکیبوں میں حسن، بیان میں سلاست و سادگی اور الفاظ میں دلآویزی نہ ہوگی۔ مضمون نگار کے خیالات دل نشیں نہیں ہو سکتے۔

مضمون کے تین خاص حصّے ہوتے ہیں: (۱) تمہید (۲) نفسِ مضمون یا مواد (۳) خاتمہ یا انجام ان میں تمہید اور خاتمہ پر مضمون نگار کو خصوصی توجہ مبذول کرنی چاہیے کیونکہ یہ مضمون کی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں۔

قواعد

کلمہ:

بامعنی لفظ کوکلمہ یا موضوع کہتے ہیں۔جیسے پھول،شہر،خط،روٹی،دوست وغیرہ کلمہ کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

(۱) اسم (۲) حرف (۳) فعل

اسم:

وہ کلمہ جس سے کسی شخص،جگہ یا چیز کا نام معلوم ہو اسم کہلاتا ہے۔جیسے شاہد،گھر،کتاب تاج محل وغیرہ۔اسم کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

(۱) اسمِ خاص یا معرفہ (۲) اسمِ عام یا نکرہ

(۱) اسم خاص یا معرفہ:

وہ اسم جس سے کسی خاص چیز،خاص شخص یا جگہ کا نام پتہ لگے جیسے:۔قرآن شریف،جے پور، ہمالہ،اکرم،نجمہ،تاج محل وغیرہ

(۲) اسم عام یا نکرہ:

وہ اسم جو ایک ہی قسم کے تمام افراد،تمام چیزوں یا جگہوں کے لئے بولا جائے جیسے:۔لڑکا، عورت،کتّا،پہاڑ،دریا،شہر پارک وغیرہ

ضمیر:

جولفظ اسم کی جگہ بولا جائے ضمیر کہلاتا ہے۔جیسے:۔میں،ہم،تم،آپ،وہ،ان وغیرہ ضمیر پانچ طرح کی ہوتی ہیں:

(۱) ضمیر شخصی:

وہ ضمیر جو کسی شخص کیلئے استعمال کی جائے اسے ضمیر شخصی کہتے ہیں یہ تین طرح کی ہوتی ہیں:

(۱) ضمیر متکلم (۲) ضمیر خاضر (۳) ضمیر غائب

(۱) ضمیر متکلم:

بولنے والا اپنے لئے جو ضمیر استعمال کرتا ہے۔ضمیر متکلم کہلاتا ہے جیسے۔میں،ہم، مجھے،ہمیں، میرا، ہمارا وغیرہ۔

(۲) ضمیر حاضر:

بولنے والا سُننے والوں کے لیے جو ضمیر استعمال کرتا ہے اسے ضمیر حاضر کہتے ہیں جیسے:۔تو،تم آپ، تجھے،تمہیں تیرا،تمہارا وغیرہ

(۳) ضمیر غائب:

وہ ضمیریں جو غیر موجود یعنی غائب کے لئے استعمال کی جائیں ضمیر غائب کہلاتی ہیں جیسے:۔وہ، اسے،انھیں،اس کا ان کا وغیرہ

(۲) ضمیر موصولہ:

وہ ضمیر ہے جس کے ساتھ ایک جملہ جڑا ہوتا ہے جو اس اسم کی وضاحت کرتا ہے جسکی جگہ وہ

استعمال کیا جاتا ہے۔جیسے:

(i) میرا دوست جو آگرہ رہتا ہے کل آرہا ہے۔

(ii) لڑکا جس نے کتاب چرائی کہاں ہے؟

ان جملوں میں جو اور جس نے ضمیر موصولہ ہیں جو بالترتیب اپنے سے پہلے آنے والے اسم دوست اور لڑکا کی وضاحت کرتے ہیں۔

(۳) ضمیر استفہامیہ:

وہ ضمیر جو سوال پوچھنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے ضمیر استفہامیہ کہلاتی ہے، جیسے :۔کون، کسنے، کیا کسکو، کسے وغیرہ۔

(۴) ضمیر تنکیر:

وہ ضمیر ہے جو غیر یقینی چیز یا شخص کیلئے آتی ہے۔کوئی اور کچھ

(۵) ضمیر اشارہ:

وہ ضمیر جو کسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بولی جائے ضمیر اشارہ کہی جاتی ہے۔

جیسے: یہ اور وہ

فعل:

وہ کلمہ جس سے کام کا کرنا یا ہونا پایا جائے فعل کہا جاتا ہے۔جیسے :۔حامد نے پڑھا۔یہ لڑکا نیک ہے۔ان جملوں میں پڑھا فعل ہے اس سے پڑھنے کا کام معلوم ہوا۔ہے بھی فعل ہے اس سے نیک ہونے کی بات معلوم ہوئی۔فعل پانچ طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) فعل معروف:

فعل جس کا فاعل معلوم ہو۔ جیسے:۔ راشد سویا، موہن نے کتاب پڑھی نجمہ نے چائے بنائی۔ ان جملوں میں سونا، پڑھنا اور بنانا فعل معروف ہیں کیونکہ ان کے فاعل راشد، موہن اور نجمہ معلوم ہیں۔

(۲) فعل مجہول:

وہ فعل جس کا فاعل معلوم نہ ہو۔ جیسے:۔ دروازہ کھل گیا، کپڑے دھل گئے آٹا پس گیا وغیرہ ان جملوں میں کُھلنا، دھلنا اور پسنا فعل مجہول ہیں کیونکہ ان کے فاعل معلوم نہیں۔

فعل لازم:

وہ فعل جس کا اثر فاعل تک ہی محدود رہے۔ جیسے:۔ حامد گیا، اسلم ہنسا، وہ بیٹھا، تم سوئے وغیرہ۔

(۴) فعل متعدی:

وہ فعل جس کا اثر فاعل سے گذر کر مفعول تک پہنچے۔ جیسے:۔ اکرم نے خط لکھا، اس نے نئی کار خریدی، سلمٰی نے دودھ پیا وغیرہ یعنی وہ فعل جن کیلئے مفعول ضروری ہو فعل متعدی کہلاتے ہیں۔

(۵) فعل ناقص:

وہ فعل ہے جو کسی پر اثر تو نہ ڈالے بلکہ کسی بات کا ہونا بتائے۔ جیسے:۔ لڑکا بیمار ہے جہانگیر ایک مغل بادشاہ تھا، میں کھلاڑی ہوں۔ ان جملوں میں ہے، تھا اور ہوں فعل ناقص ہیں۔

زمانہ:

وقت کو زمانہ کہتے ہیں۔ گذرے ہوئے زمانے کو ماضی، موجودہ زمانے کو حال اور آئندہ آنے

والے زمانے کو مستقبل کہتے ہیں۔ ہر فعل میں کوئی نہ کوئی زمانہ ضرور پایا جاتا ہے۔

فعل حال:

زمانے کے اعتبار سے وہ فعل جس کا موجودہ زمانہ میں کیا جانا معلوم ہو جیسے:۔ وہ کتاب پڑھ رہا ہے۔ راشد خط لکھتا ہے۔ تم گاتے ہو۔ وغیرہ

فعل مستقبل:

وہ فعل جو آنے والے زمانے میں کیا جائے گا۔ مثلاً وہ کپڑے دھوئے گی۔ تم گھر جاؤ گے۔ میں قلم خریدوں گا۔ وغیرہ

فعل ماضی:

وہ فعل جو گزرے ہوئے زمانے میں کیا گیا ہو۔ جیسے:۔ تم کھیل رہے تھے۔ میں نے خط پڑھ لیا۔ عذرا سو گئی۔ وغیرہ۔ فعل ماضی کی درجِ ذیل اقسام ہیں:

(۱) ماضی مطلق:

فعل کا وہ زمانہ جس میں یہ معلوم نہ ہو کہ کام ہوئے یا کئے ہوئے کتنی مدت گزر گئی۔ مثلاً:۔ حامد نے کھانا کھایا۔ اس نے برتن صاف کیے۔

(۲) ماضی قریب:

وہ فعل جو گزرے ہوئے زمانہ میں ہوا ہو مگر اسکو پورا ہوئے زیادہ وقت نہ ہوا ہو۔ جیسے راشد آیا ہے۔ میں نے دودھ پی لیا ہے۔

(۳) ماضی بعید:

وہ فعل جس کو گزرے ہوئے زمانہ میں ختم ہوئے کافی مدت گزر چکی ہو۔ جیسے اسلم آیا تھا۔ زید نے کتاب پڑھ لی تھی۔ وغیرہ

(۴) ماضی استمراری (ناتمام):

وہ فعل جو یہ ظاہر کرے کہ گزرے ہوئے زمانے میں کام کچھ عرصے تک جاری تھا۔ جیسے لڑکے میدان مین کھیلتے تھے۔ سلیم سبق یاد کررہا تھا۔

(۵) ماضی شکّی (احتمالی):

وہ فعل جو گزرے ہوئے زمانہ میں تو ہوا ہو مگر اس میں شک پایا جاتا ہو۔ جیسے ٹرین اسٹیشن سے چھوٹ گئی ہوگی۔ مریض نے دوا پی لی ہوگی۔

(۶) ماضی شرطی (تمنائی):

وہ فعل ماضی جس میں کوئی شرط یا تمنا پائی جائے۔ جیسے خدا تم کو کامیاب کرے۔ کاش اس وقت میرا دوست یہاں ہوتا۔ اگر وہ آتا تو میں اسکے گھر جاتا۔

جنس:

جنس سے اسم کے نر یا مادہ ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ نر کو مذّکر اور مادہ کو مؤنث کہتے ہیں۔ جیسے لڑکا، شیر، راجہ، دھوبی، دوست، بھائی وغیرہ مذکر اور لڑکی، شیرنی، رانی دھوبن سہیلی، بہن وغیرہ مؤنث ہیں۔

واحد:

وہ اسم ہے جس سے کسی ایک چیز یا کوئی ایک شخص مراد ہو۔ جیسے عورت، خط، کاپی، مدرسہ، یوم وغیرہ۔

جمع:

دو یا دو سے زائد افراد یا چیزوں کو بتانے والے اسم کو جمع کہتے ہیں۔ جیسے عورتیں، خطوط کاپیاں، مدارس، ایّام وغیرہ۔ جمع الجمع:۔ وہ الفاظ جو دوہری جمع یعنی جمع کی جمع کو ظاہر کرتے ہیں جمع الجمع کہلاتے ہیں جیسے:

واحد	جمع	جمعُ الجمع
خبر	اخبار	اخبارات
نور	انوار	انوارات
جوہر	جواہر	جواہرات
دوا	ادویہ	ادویات
وجہ	وجوہ	وجوہات
رکن	ارکان	اراکین

حصّہ نظم

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

غزل: ایک تعارف

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول و مشہور صنف ہے۔ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے اِس صنف میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے، اس کی پیدائش عربی قصیدہ سے ہوئی۔ اردو میں غزل فارسی شاعری کے اثر سے آئی۔ اور فارسی نے عربی زبان سے اِس صنف کو مُستعار لیا۔

غزل کے لغوی معنیٰ 'عورتوں سے حُسن و عشق کی باتیں کرنا' یا 'عورتوں کے حُسن و جمال کی تعریف کرنا ہے۔ لیکن غزل کبھی بھی اپنے اِس محدود پیرائے میں قید نہیں رہی۔ عربی ہو یا فارسی یا کہ اردو، تینوں ہی زبانوں میں اس صنف میں شعرا نے مختلف کیفیات، جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یعنی عورتوں سے حسن و عشق یا پیار محبت کی باتوں کے علاوہ بھی اس صنف میں مذہب، اخلاق تصوف، پند و نصائح، میدانِ جنگ کا بیان، فلسفیانہ مضامین، مظاہرِ قدرت، سماجی و سیاسی خیالات وغیرہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ لھذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''غزل ایک ہمہ گیر صنفِ سخن ہے'' ہئیت کے اعتبار سے غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ جس کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ پایا جاتا ہے۔ (غزل میں قافیہ کا ہونا لازمی ہے۔) مطلع کے بعد بھی اگر کسی شعر کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ ہو تو اُس شعر کو حُسن مطلع کہتے ہیں۔ غزل کے باقی اشعار کے محض دوسرے مصرعوں میں ہی ردیف و قافیہ ہوتا ہے۔ ایسے اشعار کو 'بیت' یا 'فرد' کہتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلّص استعمال کرتا ہے، اسے مقطع کہتے ہیں۔

معنوی اعتبار سے غزل کے سب سے اچھے شعر کو 'بیت الغزل' کہتے ہیں، لیکن اس کا انتخاب غزل کہنے یا سننے والے پر منحصر ہوتا ہے غزل کا ہر ایک شعر اپنے آپ میں ایک مکمل اِکائی ہوتا ہے۔ یعنی غزل کے ایک شعر کا تعلق دوسرے شعر سے نہیں ہوتا، لیکن بعض اوقات شاعر کوئی بات یا خیال ایک شعر میں ادا

نہیں کرسکتا ہے تو وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لیے دوسرے شعر کا سہارا لیتا ہے۔ لٰھذا ایسے اشعار مربوط ہوتے ہیں اور انھیں قطعہ بند شعر کہتے ہیں۔ غزل میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ ایک مکمل غزل میں کم سے کم پانچ اشعار ہوتے ہیں۔ زیادہ کی کوئی قید نہیں۔ عموماً غزل میں پانچ، سات، نو، گیارہ، تیرہ، پندرہ، سترہ، اُنّیس اور اکّیس اشعار تک ہوتے ہیں۔ غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز واختصار ہے یعنی کم الفاظ میں شاعر بہت کچھ بیان کر دیتا ہے۔ اور یہی امر غزل کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اردو غزل کو مقبولیت اور آفاقیت بخشنے والے شعرا میں سرِ فہرست میر تقی میرؔ ہیں۔ ان کے علاوہ ولیؔ دکنی، مرزا محمد رفیع سوداؔ خواجہ میر دردؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، حکیم مومن خان مومنؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، نواب مرزا داغؔ وغیرہ نے اِس صنف میں کمال دکھایا۔ مولانا حسرتؔ موہانی، فانیؔ بدایونی، جگرؔ مرادآبادی، عزیزؔ لکھنوی، اصغرؔ گونڈوی، شادؔ عظیم آبادی، فراقؔ گورکھپوری وغیرہ نے بھی اس صنف میں کمال دکھایا۔

میر تقی میرؔ

میر تقی نام اور میرؔ تخلص تھا والد کا نام میر علی متقی تھا۔ اکبر آباد (آگرہ) میں ۱۱۳۵ھ ۲۳-۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ میرؔ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد صوفی منش اور اللہ والے بزرگ تھے۔ میرؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان ہی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ دس سال کی عمر ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، سوتیلے بھائیوں نے پریشانی کرنا شروع کیا تو تنگ آ کر دہلی چلے آئے۔ یہاں صمصام الدولہ نے ان کی پرورش کی، لیکن نادر شاہ کے حملے کے بعد وہ دل برداشتہ ہو کر واپس آگرہ چلے آئے آگرہ میں بھی سکون نہ ملا اور عزیزوں کی ستم ظریفی سے پریشان اور عاجز آ کر پھر سے دہلی کا رُخ کیا اور اب یہاں اپنے سوتیلے ماموں اور اُس زمانے کے مشہور شاعر و ادیب سراج الدین خاں آرزوؔ کے یہاں ٹھہرے۔ یہاں بھی میرؔ کو سکون نصیب نہیں ہوا۔ اب ان کو سوتیلے ماموں اور ممانی نے زدکوب کرنا شروع کیا اور انتہا یہ تھی کہ انھیں کئی کئی دنوں تک بھوکے ہی رکھا جاتا تھا۔ ایسے المناک ماحول سے تنگ آ کر میر نے گزر اوقات کے لیے ملازمتیں کیں۔ لیکن میرؔ کے نصیب میں اب بھی سکون میسّر نہ تھا۔ اس دوران احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملے کرا سے تباہ و برباد کر دیا۔ لوٹ اور قتل و غارت گری برپا کی۔ دہلی کے بڑے بڑے رئیس اور شریف لوگ دہلی چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ میرؔ نے بھی اسی عالم میں دہلی کو چھوڑا اور نواب آصف الدولہ کی دعوت پر ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ چلے آئے اور آخر دم تک یہیں رہے۔ ۲۰ر شعبان ۱۲۲۵ھ مطابق ۲۰ر ستمبر ۱۸۱۰ء کو میرؔ کا انتقال ہوا۔

میرؔ جب دس سال کے تھے تب ہی انھوں نے ماموں سراج الدین خاں آرزوؔ اور میر جعفر عظیم

آبادی سے علمی وادبی فیض حاصل کیا۔ نیز سید سعادت علی امروہوی کی تلقین پر اردو میں شعر گوئی شروع کی۔ بیس سال کی عمر تک میرؔ کی شاعری کا ڈنکا دور دور تک بجنے لگا۔ صوفیانہ مزاج، والد کی تربیت اور زمانے کی ستم ظریفی نے میرؔ کی شاعری میں درد واثر، حرماں ویاس کو جیسے پیوست کر دیا تھا۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ درد وغم، رنج والم، آہ وفغاں، نالہ وفریاد اور حرماں ویاس نظر آتا ہے۔ میرؔ کے ہی چند اشعار سے بطور مثال ان عناصر کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ ؎

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اسی وجہ سے میرؔ کی غزل کو ان کے عہد اور ان کی زندگی کا مرقع کہا جاتا ہے۔ خود میرؔ اپنی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں۔ ؎

جہاں سے دیکھیے اک شعرِ شورانگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے برپا میرے دیوان میں

میرؔ اردو کے عظیم غزل گو شعرا میں سرِ فہرست ہیں۔ ان کی عظمت کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے شاعری کو درد اور درد کو شاعری بنا دیا۔ ان کی شاعری سے ان کے ذاتی تجربات اور اس زمانے

کے سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ان کی زبان سادہ، شستہ اور بے تکلف ہے۔شاعری میں انھوں نے عام فہم اور با محاورہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔میرؔ کے اردو میں چھ دیوان مشہور ہیں۔جن میں بہت بڑی تعداد غزلیات کی ہے۔غزل کے علاوہ میرؔ نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔میرؔ کی مثنویوں میں 'خواب وخیال'، 'شعلۂ عشق'، 'دریائے عشق'، 'معاملاتِ عشق'، 'ہولی'، 'ساقی نامہ'، 'شکار نامہ' اور 'مذمتِ دنیا' مشہور ہیں۔اپنے مزاج اور خودداری کے سبب میرؔ نے قصیدے بہت کم لکھے۔اس کے علاوہ انھوں نے مرثیہ، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند بھی لکھے۔یہ تمام اردو کلام مل کر ''کلیاتِ میر'' کے نام سے مشہور ہے اور کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

میرؔ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی۔ان کا فارسی میں ایک دیوان بھی ہے۔انھوں نے فارسی زبان میں ہی اردو شعرا کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' کے نام سے بھی تحریر کیا۔میرؔ نے اپنی خود نوشت ''ذکرِ میرؔ'' میں اپنے حالات قلم بند کیے ہیں۔میرؔ کی ہمہ گیر شخصیت اور اردو کلام (غزلیات) کی وجہ سے ہی انھیں ''خدائے سخن'' اور ''امامِ غزل'' جیسے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔

میر تقی میرؔ

غزل (۱)

تھا مُستعار حُسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خُدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

(ق)

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

غزل(۲)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

حُسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

جامۂ احرامِ زاہد پر نہ جا
تھا حَرَم میں لیک نا محرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح گذری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ جیتا یاں بہت دن کم رہا

مشکل الفاظ اور اُن کے معنی

غزل (۱)

الفاظ	معنی
مُستعار	اُدھار لیا ہوا، مانگا ہوا۔
خورشید	آفتاب سورج
ذرّہ ظہور	معمولی جھلک، ادنیٰ جھلک
ہنگامہ گرم کن	شور غل ہونا، فتنہ وفساد ہونا
ناصبور	بے صبر بے قرار
شورِ نشور	قیامت کا شور
پرتو	سایہ
سپہر	آسمان
استخوان	ہڈّیاں
فہم	عقل سمجھ

غزل (۲)

الفاظ	معنی
دل کا جانا	عشق ہونا
عالم فریب	دنیا کو دھوکا دینا
خط	داڑھی کے بال
جامۂ احرام	احرام وہ دو بغیر سلی سفید چادریں جو بوقت حج اور عمرہ مکۂ معظّمہ میں مرد پہنتے ہیں۔
حرَم	خانۂ کعبہ
نامحرَم	بے گانہ، پرایا، غیر۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ خدائے سخن کسے کہا، جاتا ہے؟

۲۔ میر تقی میرؔ کب پیدا ہوئے؟

۳۔ میرؔ کے والد کا کیا نام تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ 'مطلع' اور 'مقطع' کی تعریف لکھیے۔

۵۔ قطع بند شعر کسے کہتے ہیں؟

۶۔ میرؔ کی مذکورہ غزل نمبر ا کے مطلع کا مطلب لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

۷، میر تقی میرؔ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیجیے۔

۸۔ میر تقی میرؔ کی مذکورہ غزل نمبر ا کے شعر نمبر ۲/۳/۴/ اور غزل نمبر ۲ کے شعر نمبر ۱/۳ اور ۵ کے مطلب لکھیے۔

خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ حیدر علی نام اور آتش تخلّص تھا۔۱۱۹۲ مطابق ۱۷۷۸ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔آتش کے والد خواجہ علی بخش دلی کے ایک معزّز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔دلّی کی تباہی کے بعد عہدِ نواب شجاع الدولہ میں دہلی سے فیض آباد آئے۔اور یہاں کے محلّہ مغل پورہ میں قیام کیا۔یہیں پر آتش پیدا ہوئے۔کم عمری میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس لیے باقاعدہ تعلیم پوری نہ کر سکے۔

لیکن بعد میں کسی طرح عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ابتدائی عمر سے ہی شاعری کا شوق تھا اور مشاعروں میں حصّہ لیتے تھے۔فیض آباد میں ہی سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا اور نواب محمد تقی خاں تقی کے ملازم ہو گئے۔بعد میں جب اودھ کا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا تو نواب صاحب بھی لکھنؤ آ گئے۔ آتش بھی ان ہی کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔لکھنؤ میں شعر و شاعری کا زور تھا۔اس زمانے کے مشہور شاعر انشاء اللہ خاں انشاؔ اور غلام ہمدانی مصحفیؔ جیسے باکمال شعرا کے درمیان معرکہ آرائیاں زوروں پر تھیں۔ شاعر آتش کا شوق بھی بیدار ہوا اور وہ مصحفیؔ کے شاگرد ہو گئے۔آتش کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔انھوں نے فارسی، علمِ نجوم، فن خطّاطی، منطق، اسلامیات، تاریخ اور اردو شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔بعد میں ملازمت ترک کر کے وہ فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرنے لگے، مزاج میں قناعت، توکل اور خودداری بھری ہوئی تھی، شاہی دربار سے اسّی روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔پندرہ روپیہ گھر میں دیتے تھے۔باقی راہِ خدا میں خرچ کر دیتے تھے۔اکثر فاقوں کی نوبت آ جاتی تھی، لیکن کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ بڑھاپے تک سپاہیانہ وضع قطع و بانکپن کے ساتھ زندگی گذاری، اور بالآخر ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ ر

۱۸۴۷ء کو لکھنؤ میں ہی انتقال کیا۔

آتش نے جس زمانے میں شاعری شروع کی وہ زمانہ اردو شاعری میں اصلاح و معیار بندی کا زمانہ تھا۔ اردو شاعری میں سادگی، تاثیر اور پُرسوز اظہار کی جگہ معاملہ بندی، رعایتِ لفظی، بندشِ الفاظ اور خارجی جذبات و خیالات نے جگہ لے لی تھی۔ لکھنؤ میں ان کے ہم عصر شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کی شاعری اور اُن کے نئے طرز کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ناسخ کا کلام رنگین، پُرشکوہ اور خارجی جذبات سے پُر اور تمثیل بندی سے لبریز تھا۔ جبکہ آتش کے کلام میں سادگی، آمد، درد و تاثیر اور محاورات و روزمرہ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ آتش نے اپنی شاعری میں مشکل اور سخت الفاظ کا بہت کم استعمال کیا ہے۔ زبان سادہ، خیالات مؤثر اور اعلیٰ درجے کے ہیں۔ ان کے کلام میں روانی اور تاثیر ہے۔ اور ساتھ ہی عشقیہ مضامین کے علاوہ صوفیانہ اور فلسفیانہ مضامین بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ الفاظ کی بندش اور خیالات میں بانکپن ان کی شاعری کا خاصہ ہیں۔ شاعری کے متعلق خود کہتے تھے ۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

آتش کا کلام دو دیوان پر مشتمل ہے۔ جن میں تقریباً ساڑے آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ تین فردیات اور ایک مخمس بھی آتش سے منسوب ہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کافی ہے۔ جن میں نواب مرزا شوق لکھنوی، پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی اور نواب واجد علی شاہ اختر جیسے نامور شعرا شامل ہیں۔

خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی

غزل (۱)

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رو برو کرتے
ہم اور بُلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہُوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی جَیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ موکرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتشؔ
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

غزل (۲)

کام ہمّت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں
زہر پی کر مزۂ شیر وشکر لیتا ہے

منزلِ فقر و غنا جائے ادب ہے غافل
بادشاہ تخت سے یاں اپنے اثر لیتا ہے

عقل کر دیتی ہے انساں کی جہالت زائل
موت سے جان چُھپانے کو سپر لیتا ہے

غیرتِ نالہ و فریاد نہ کھو اے آتشؔ
آشنا کوئی نہیں، کون خبر لیتا ہے

مشکل الفاظ اوران کے معنی

غزل نمبر ۱

الفاظ	معنی
آرزو	تمنّا،خواہش
روبرو	آمنے سامنے،مقابل
شرح آرزو	خواہش یا تمنّا کا اظہار
حبیب	دوست
سیاہ مو	کالے بال
طالع	قسمت،نصیب
گل	پھول
پیامبر	قاصد،پیغام لانے والا،سفیر
مہ ومہر	چاند اور سورج
جستجو	تلاش
عالمِ برگشتہ	زمانے کی گردش
باراں	بارش،برسات

غزل نمبر۲

الفاظ	معنی
جواں مرد	سورما، بہادر
گنجینہ	خزانہ
زر	مال ودولت
ناگوارا	ناپسند،طبیعت کے خلاف
شیر	دودھ
فقر	درویشی
غنا	دولت مندی، بے نیازی
جائے ادب	ادب کا مقام
غافل	بےخبر، بے پروا
زائل	دور ہونے والی
سِپر	ڈھال، پناہ،حفاظت
نالہ وفریاد	آہ وزاری،شوروغل
آشنا	جان پہچان والا،شناسا

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ خواجہ آتشؔ کا پورا نام بتائیے۔

۲۔ آتشؔ کا انتقال کب ہوا؟

۳۔ گنجینۂ زر کے کیا معنی ہیں؟

مختصر سوالات:

۴۔ یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے
اس شعر میں شاعر نے کس خواہش کا اظہار کیا ہے؟

۵۔ آتشؔ کے مطابق انسان کو مال و دولت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

۶۔ خواجہ آتشؔ کے مشہور شاگردوں کے نام بتائیے۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ خواجہ آتشؔ کے حالاتِ زندگی اور ان کلام کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

۸۔ آتشؔ کی مذکورہ غزل نمبر ۱ کے شعر ۱/ ۲/ ۳ اور ۷ کے مطلب لکھیے۔

مرزا غالبؔ

اسداللہ خاں نام اور مرزا نوشہ عرفیت تھی۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے بعد میں غالبؔ اختیار کیا۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ جیسے معزز خطاب ملے۔ غالبؔ ۸/رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء بروز بدھ اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ خاں بیگ اور والدہ عزت انساء بیگم تھیں۔ مرزا غالبؔ کا خاندان سلجوقی ترک تھا۔ ان کے دادا مرزا قوقان بیگ شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ترکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ غالبؔ کم عمری میں ہی باپ کے سایے سے محروم ہوگئے تو شفیق چچا مرزا نصراللہ بیگ نے پرورش کی۔ جو اکبرآباد (آگرہ) کے صوبے دار تھے۔ غالبؔ جب ۹۔۸ برس کے ہوئے تو چچا نصراللہ بیگ بھی انتقال کر گئے۔ چچا کی جاگیر کے معاوضے میں سات سو روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی، سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہ رہنے کی وجہ سے بچپن میں ہی بے راہ روی کا شکار ہوگئے اور باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ انھوں نے ابتدائی زمانے میں فارسی زبان کی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ پھر نومسلم ملا عبدالصمد پارسی سے فارسی و دیگر علوم کی تعلیم حاصل کی۔ غالبؔ کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے محض گیارہ برس کی عمر سے ہی شاعری شروع کردی۔ حالات کے پیش نظر مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔

مرزا جب تیرہ برس کے ہوئے تو ۱۲۲۵ھ میں ان کی شادی الٰہی بخش خاں معروفؔ کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوگئی۔ اب غالبؔ نے دہلی میں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں علم و ادب کا ماحول تھا۔ غالبؔ کی ملاقات مولانا فضل حق خیرآبادی سے ہوئی تو ان کے مزاج میں بہت بڑی تبدیلی آئی اور

غالبؔ نے علم وادب کی جانب با قاعدہ توجہ دینا شروع کیا۔ دہلی کے قیام کے زمانے میں غالبؔ کو ہمیشہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ کے لیے پچاس روپیہ ماہوار پنشن مقرر کی، جو غالبؔ کی ضرورتوں کے اعتبار سے بہت کم تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد یہ پنشن بھی بند گئی۔ یہ دور غالبؔ پر بہت سخت گزرا۔ کچھ دنوں بعد نواب رام پور نے سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ لیکن مرزا کے لیے یہ بھی ناکافی تھی۔ اس زمانے میں دہلی کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات بہت خراب تھے۔ غالبؔ پر بھی ان کا اثر ہونا لازمی تھا۔ لھذا وہ عمر بھر پریشان حال رہے۔ جس کا ذکر انھوں نے جا بجا اپنی شاعری میں بھی کیا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالبؔ نے دہلی کے حالات کے مدِّ نظر حصول معاش کی غرض سے کلکتہ، لکھنؤ اور رام پور کے سفر کیے۔ کلکتہ سفر کے بعد ۱۸۶۰ء میں بند ہوئی پنشن پھر بحال ہوگئی۔ لیکن اب غالبؔ کی صحت بہت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ آخر کار کئی برسوں کی سخت بیماری کے بعد ۳ر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء بروز پیر بوقت سہ پہر دہلی میں ہی انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے قریب ہی سپردِ خاک کیے گئے۔

غالب شگفتہ مزاج، بذلہ سنج، باوضع اور کثیر الاحباب شخص تھے۔ خودداری، رواداری، فیّاضی اور اخلاص ان کے مزاج میں سمایا ہوا تھا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے زبردست شاعر اور انشا پرداز تھے۔ فارسی میں ان سے بڑا شاعر ہندوستان میں شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ اردو شعرا میں بھی میر تقی میرؔ کے بعد اردو غزل کے میدان میں غالبؔ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ مرزا کے کلام میں شاعری کی تمام خوبیاں بیک وقت موجود تھیں۔ ندرتِ خیال، سادگی و پُرکاری، سلاست و روانی، اختصار، فلسفہ و فکر اور جدت طرازی

ان کی شاعر کا جوہر تھیں، شاعری کی عام روایات سے علاحدہ ہٹ کر انھوں نے اپنا نیا طرز اور نیا انداز بیان ایجاد کیا۔ غالبؔ کی شاعری میں ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات اور احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں شوخی وظرافت کے ساتھ غمِ عشق، غم روزگار اور آپ بیتی و جگ بیتی سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ یہی طریقہ انھوں نے اپنی نثر نگاری میں بھی اختیار کیا۔ فارسی میں کلیاتِ نظم فارسی، لطائفِ غیبی، تیغ تیز، قاطعِ برہان، پنج آہنگ، سبدِ چین، مہر نیم روز، دستنبو وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ اردو شاعری میں دیوانِ غالبؔ (غزلیات وقصائد) اور اردو نثر میں عودِ ہندی، 'اردوے معلیٰ' (اردو خطوط کے مجموعے) ان کا سرمایہ ہیں، جو غالبؔ کی عظمت کے ثبوت ہیں۔ جسکا اعتراف شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر اقبالؔ نے اس طرح کیا ہے ۔

"نطق کو سوناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

شاہد مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

مرازغالبؔ

غزل(۱)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مُشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ "مدّعا کیا ہے ؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امّید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

غزل (۲)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو ، گر بُرا کہے کوئی　　نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند　　کس کی حاجت رَوا کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گِلہ کرے کوئی

مشکل الفاظ اوران کے معنی

غزل (۱)

الفاظ	معنی
مُشتاق	خواہشمند، چاہنے والا
بیزار	پریشان
مدعا	مقصد
ہنگامہ	شوروغل
درویش	فقیر
نثار	قربان

غزل(۲)

ابنِ مریم	حضرت عیسیٰ
حاجت مند	ضرورتمند
رَوا	جاری
توقع	امّید
گِلہ	شکایت،شکوہ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات

۱۔ مرزا غالبؔ کا پورا نام بتایئے۔

۲۔ غالبؔ سے پہلے مرزا کا تخلص کیا تھا۔

۳۔ غالبؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

مختصر سوالات:

۴۔ ابن مریم سے کیا مراد ہے؟

۵۔ ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے؟

اس شعر میں غالبؔ نے کیا بات بیان کی ہے؟

۶۔ نہ سنو گر بُرا کہے کوئی۔ نہ کہو گر بُرا کرے کوئی،

اس شعر میں غالبؔ نے کیا نصیحت کی ہے؟

تفصیلی سوالات

۷۔ مرزا غالبؔ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی غزل گوئی کی خوبیاں بیان کیجیے۔

۸۔ غالبؔ کی مذکورہ غزل نمبر ۱ کے شعر نمبر ۱/ ۲/ ۳/ ۴ اور غزل نمبر ۲ کے شعر نمبر ۱/۳ اور ۴ کے مطلب لکھیے۔

مولانا حسرتؔ موہانی

سید فضل الحسن نام اور حسرتؔ تخلّص تھا۔ قصبہ موہان ضلع انّاؤ (یو۔پی) میں ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے موہانی لکھتے تھے۔ والد کا نام سید ازہر حسن اور والدہ کا نام شہر بانو تھا۔ حسرتؔ کے جدِ اعلیٰ سید محمود نیشاپوری اپنے وطن نیشاپور سے عہدِ سلطان شمس الدّین التمش میں ہندوستان آئے اور موہان میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم روایتِ زمانہ کے مطابق گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر پانچ سال کی عمر سے موہان کے میاں جی سید غلام علی کے مکتب میں عربی فارسی اور اسلامیات کی تعلیم حاصل کی۔ مڈل کا امتحان موہان سے امتیازی نمبروں سے پاس کرنے پر وظیفہ حاصل کیا۔ میٹرک کی تعلیم کے لیے فتح پور گئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سے ۱۸۹۸ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور پورے ضلع میں اول آئے۔ اور یہاں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ اسی دوران مولانا سید ظہور الاسلام اور مولانا امیر خاں سے فارسی بھی پڑھتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بی۔اے۔ کیا، اور علی گڑھ سے ہی رسالہ ''اردوے معلیٰ'' جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعے قدیم اُردو اساتذہ کا کلام ہمارے سامنے آیا۔ انھوں نے دیوانِ غالبؔ کی شرح بھی لکھی۔

حسرتؔ کی نانی اور والدہ دونوں تعلیم یافتہ تھیں اور ادبی و شعری ذوق رکھتی تھیں لٰہذا ان دونوں خواتین کے اثر سے حسرتؔ کو بھی بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ رسالہ ''اردوے معلیٰ'' کے ذریعہ حسرتؔ نے صحافت کو زبان، اخلاق و آداب سکھائے اور یہ شائستگی کے اصولوں سے ہم کنار کیا۔ لیکن برطانوی حکومت کے جبر و تشدد کی وجہ سے یہ رسالہ بند ہو گیا تو انھوں نے ۱۹۱۴ء میں سہ ماہی رسالہ ''تذکرۃ الشعرا'' نکالا مگر یہ بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں کان پور سے اخبار ''مستقبل'' جاری کیا۔

حسرتؔ موہانی جنگ آزادی کے صفِ اول کے مجاہد تھے۔ان کی بیوی نشاط النسا بیگم نے بھی جدو جہدِ آزادی میں حصّہ لیا تھا۔حسرتؔ نے اپنی شاعری اور جدو جہد سے جنگِ آزادی میں کارِنمایاں انجام دیے آزادی کے بعد وہ ممبر پارلیا منٹ بھی رہے۔ وہ نیک اور مذہب پرست انسان تھے انھوں نے کئی مرتبہ حج کا فریضہ بھی ادا کیا تھا۔آخر مرتبہ ۱۹۵۰ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔۱۳مئی ۱۹۵۱ءکولکھنؤ کے فرنگی محمل میں انتقال ہوااورانوار باغ کے فرنگی محل قبرستان میں دفن کیے گئے۔

حسرتؔ کوشعرو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔انھوں نے شاعری میں تسلیمؔ لکھنوی اور جلالؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔تصوف کا رنگ ابتدا سے ہی غالب تھا وہ جملہ اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ان کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ جہاں ان کی شاعری میں سیاسی رجحانات کے ساتھ ہی آزادی، بے خوفی اوراصول پسندی کے اصول جھلکتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں قدیم شعرا کا رنگ اورتصوف اورعشق کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ان کے یہاں میرؔ کا سوز و گداز، مصحفیؔ کی سلاست وروانی، غالبؔ کا فلسفہ وفکراور ندرتِ بیان، مومنؔ کا تغزّ ل، نسیمؔ وتسلیمؔ کی شوخی و رنگینی پائی جاتی ہے۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسرتؔ کی شاعری میں قدیم اور جدید شعرا کے رنگ اورآہنگ کی آمیزش ہے۔اسی لیے ان کے شعر سنتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں۔اپنی شاعری کے متعلق خودفرماتے ہیں ۔

طبعِ حسرتؔ نے اُٹھایا ہے ہراستاد سے فیض　　　　غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ

حسرتؔ کی شاعری میں نئے رنگِ تغزل کے ساتھ ہی قدیم اوصاف شاعری مثلاً درد واثر، شیرنی و دلکشی، لطافتِ بیان، جدتِ اسلوب، سچے اورصحیح جذبات کی عکاسی، جوش وخروش، شوخی وشگفتگی اورعشقیہ جذبات واحسات کی کارفرمائی اورسیاسی ومذہبی خیالات کی فراوانی بھی نظر آتی ہے۔

حسرتؔ موہانی

غزل (۱)

چُپ کے چُپ کے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

تجھ سے ملتے ہی وہ کچھ بے باک ہوجانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ اُنگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹّے سے ترا وہ منہ چُھپانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدّتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

باوجود اِدّعا ے اِتقّا حسرتؔ مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

غزل(۲)

نگاہِ یار جسے آشنا ئے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دِلوں کو فکرِ دو عالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خِرد کا نام جنوں پڑگیا جنوں کا خِرَد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ اُن کے دردِمحبت سے ساز باز کرے
ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالبًا یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے
ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

مشکل الفاظ اوران کے معنی

غزل(۱)

الفاظ	معنی
بے باک	بےخوف، دلیر،شوخ۔
دفعتاً	اچانک، یکا یک
برگشتہ	باغی، سرکش، مُنحرف
اِدّعاے اِتقا	حرص ولالچ کا دور

غزل(۲)

آشنائے راز	بھید سے واقف ہونا، راز جاننا
جنوں	دیوانہ پن، سودا
خِرد	عقل، سمجھ
فَراغ	چھٹی، نجات
سازباز	سازش، کسی کے خلاف گٹھ جوڑ
اربابِ امتیاز	خاص لوگ
سزاوار	لائق، مناسب
سرفراز	ممتاز، مُعزز

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ حسرتؔ موہانی کا پورا نام بتایئے۔

۲۔ حسرتؔ موہانی کہاں پیدا ہوئے؟

۳۔ شاعر چُپ کے چُپ کے کیا کرتا ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے کون کون سے رسائل اور اخبار جاری کیے؟

۵۔ مندرجہ ذیل مُرکب الفاظ کے معنی بتایئے۔

اِدّعائے اِتّقا۔ عہدِ ہوس۔ نگاہِ یار۔ آشنائے راز۔

۶۔ مندرجہ ذیل محاوروں کے معنی بتایئے۔ اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال بھی کیجیے۔

دانتوں میں انگلی دبانا۔ بے باک ہونا۔ مُنہ چھپانا۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ حسرتؔ موہانی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے اور ان کی غزل گوئی کی خوبیاں بھی بتایئے۔

۸۔ حسرتؔ موہانی کی شاملِ نصاب غزل نمبر۲ کے تمام اشعار کے مطلب لکھیے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہین

صنفِ نظم : ایک تعارف

نظم عربی زبان کا لفظ ہے۔لغت نویسوں نے نظم کے معنی ''لڑی میں پرونا'' بتائے ہیں۔بعض حضرات کے نزدیک انتظام، ترتیب اور آرائش کا عمل نظم کہلاتا ہے، علمائے ادب نے متفقہ طور پر کلامِ موزوں کو نظم قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نظم ایسی شاعرانہ تخلیق ہوتی ہے جس میں شاعر کسی تصوّر، خیال یا موضوع کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کرتا ہے اور نظم کا لفظ ادبی اصلاح میں دو (۲) معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے اول یہ کہ نظم وہ صنف ہے جو نثر کے مدِّ مقابل ہوتی ہے یعنی نظم کا اسالیب اور ہئیت کے لحاظ سے نثر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دوئم یہ کہ صنفِ غزل کو چھوڑ کر باقی تمام اصناف نظم کے دائرے میں آتی ہیں جن میں مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، مسدس اور قطعہ وغیرہ شامل ہیں، یعنی غزل کی طرح نظم کی کوئی ایک مخصوص ہئیت مقرر نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اثرات کے پیشِ نظر نظم کے ساتھ لفظ ''جدید'' جوڑ دینے سے ''جدید نظم'' کی اصطلاح وجود میں آئی۔

غزل کے برعکس نظم ایک ایک مصرعہ سے مل کر بنتی ہے، جس طرح کڑی سے کڑی مل کر زنجیر اور پھول سے پھول ملا کر مالا تیار ہوتی ہے۔غزل کی طرح نظم میں بھی بلا کا تنوّع موجود ہوتا ہے، اسی لیے ہر قسم اور ہر قبیل کے موضوعات نظم کے دائرے میں شامل ہوتے ہیں۔نظم کسی ایک موضوع یا مفہوم پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی اپنے ارتباط و تسلسل سے منسلک رہتی ہے۔نظم میں مرکزی خیال کا پورا لحاظ لازمی قرار دیا گیا ہے اسی لیے ناقدینِ ادب نے ارتقائے خیال کو نظم کی روح کہا ہے۔تغیّراتِ زمانہ کے مطابق نظم نے

بھی کروٹیں بدلی ہیں، چنانچہ پابندنظم، نظم مُعرّا، آزادنظم اور نثری نظم جیسے اَقسام کے تحت نظم نیا رنگ وآہنگ لے کر جلوہ نما ہوتی رہی ہے۔

پابندنظم سے مراد وہ نظم ہے جس میں قوافی کی ترکیب میں مروّجہ اصول وضوابط کی پابندی کی جاتی ہے۔اس ذیل میں مربّع مخمّس، مسدّس، ترجیع بند اور گیت وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ پابندنظم میں قوافی کے التزام کے ساتھ مصرعوں کا مساوی یعنی برابر ہونا ضروری ہوتا ہے۔

نظمِ معرّا اُس نظم کو کہا جاتا ہے جس کے تمام مصرعے برابر ہوں لیکن قافیے کی پابندی نہ ہو۔شاید یہی سبب ہے کہ نظمِ مُعرّا کو بعض حضرات نے ''عاری نظم'' بھی کہا ہے۔

آزادنظم میں ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے نہ ہی کسی بحر کے مروجہ اصولوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔لیکن وزن کا لحاظ بہرحال ضروری ہوتا ہے۔اس لیے آزادنظم کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔انگریزی میں آزادنظم کے لیے Freeverse کی اصطلاح مرّوج ہے۔

نثری نظم بھی آزادنظم کی طرح چھوٹی بڑی سطور پر مبنی ہوتی ہے۔اس میں ردیف، قافیہ، بحر اور وزن کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔

اُردو میں نظم نگاری کی روایت خاصی قدیم ہے۔اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ معانؔی اور ان کے بعض معاصرین کی بیش تر بہاریہ تخلیقات نظم کے ذیل میں آتی ہیں۔نظیرؔ اکبرآبادی نے عوامی موضوعات پر نظمیں لکھ کر نظم نگاری کو تقویت بخش کر آگے بڑھایا۔۱۸۷۴ء میں جب مولانا محمد حسین آزادؔ نے لاہور میں ''بزمِ مناظمہ'' کی بنیاد رکھی تو نظم کو پھلنے اور پھولنے کے مواقع فراہم ہوئے اور نظم کا رشتہ حقیقی زندگی سے جُڑنے لگا۔فطری، اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور قومی وسیاسی موضوعات پر کھل کر شاعری ہونے لگی۔مولانا الطاف حسین حالیؔ نے ''مقدمۂ شعروشاعری'' میں نظم کی حمایت کر کے نئے راستے کھول دیے جس کے نتیجے میں علاّمہ شبلیؔ نعمانی، علاّمہ اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی، برج نرائن چکبستؔ، نظمؔ

طباطبائی اور شوقؔ نیموی وغیرہ نے نظم کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ آگے چل کر ترقی پسند شاعروں مثلاً جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، اسرالحق مجازؔ، پرویزؔ شاہدی، وامقؔ جون پوری، علی سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، احمد ندیمؔ قاسمی، ساحرؔ لدھیانوی، معینؔ احسن جذبی، غلام ربّانی تاباںؔ، مخدوم محی الدین اور جاں نثار اخترؔ وغیرہ نے نظم نگاری کی روایت کو مضبوطی عطا کی۔ ن۔م۔ راشدؔ، میراجی اور اخترؔ شیرانی نے نظم گوئی کو اعتبار بخشا۔ ۱۹۶۰ء تا حال اخترؔ الایمان، محمد علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، شادؔ عارفی، شہریارؔ اور ندافاضلی جیسے شعراء نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کی بھی آبیاری کی۔

نظیر اکبرآبادی

اردو ادب کی تاریخ میں نظیر اکبرآبادی ''عوامی شاعر'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔نظیر کا اصل نام شیخ ولی محمد تھا۔۱۷۴۰ء میں اُن کی ولادت دہلی میں ہوئی۔نظیر اپنے والد شیخ محمد فاروق کے انتقال کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ (اکبرآباد) میں بس گیے اور اسی نسبت سے اکبرآبادی کہلائے۔نظیر نے گزر بسر کے لیے معلّمی کا شریفانہ پیشہ اختیار کیا۔بقول عظیم الحق جنیدی نظیر ''شعر کہنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے چنانچہ شعر کہنے لگے تو کسی سے اصلاح نہ لی۔نظیر کو کسی دبستان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔وہ خود ایک دبستان تھے۔'' نظیر کو عربی، فارسی، اردو کے علاوہ پنجابی، مارواڑی، ہندی اور برج بھاشا کا بھی علم حاصل تھا۔علاوہ ازیں نجوم، طب، منطق اور فلسفے میں بھی ان کی دلچسپی تھی۔نظیر کا بیشتر کلام عوامی موضوعات سے متعلق ہے۔وہ سبھی مذاہب کا احترام کرتے تھے۔انھوں نے مختلف میلوں، تہواروں اور عقائد سے متعلق نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں ''آدمی نامہ''، ''ہولی نامہ''، ''بنجارہ نامہ''، ''کرشن کنھیا کا بال پن''، ''دیوالی''، ''عید الفطر''، ''شبِ برأت'' اور ''مفلسی'' وغیرہ اہم ہیں۔نظیر کی نظموں میں جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔۱۸۳۰ء میں نظیر نے آگرہ میں وفات پائی۔

نظیر کی نظم ''خوشامد'' میں انسانی خصلت یعنی خوشامد پر طنز کیا گیا ہے۔یہ ایسی عادت ہے جو انسان کو مفاد پرست بنا دیتی ہے۔خود دار طبیعت لوگ خوشامد نہیں کرنے کی وجہ سے نقصان اور تکلیف جھیلتے ہیں ایسا شاعر کا خیال ہے۔اس نظم کا ایک ایک لفظ حقیقت وصداقت لیے ہوئے اور تاثیر میں ڈوبا معلوم ہوتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی

خوشامد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے
آدمی جن و پری، بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش، باپ چچا راضی ہے
شاہ مسرور، غنی شاد، گدا راضی ہے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے
اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے
انبیاء اولیا اور رب کی خوشامد کیجئے
اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

عیش کرتے ہیں وہی جن کا خوشامد ہے مزاج
جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ محتاج
ہاتھ آتا ہے خوشامد سے مکاں، ملک اور راج
کیا ہی تاثیر کی اس نسخے نے پائی ہے رواج

جوخوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

جو کہ کرتے ہیں خوشامد وہ بڑے ہیں انساں
جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمشہ حیراں
ہاتھ آتے ہیں خوشامد سے ہزاروں ساماں
جس نے یہ بات نکالی ہے میں اس کے قرباں

جوخوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مرد وزن، طفل و جواں، خرد وکلاں پیر وفقیر
جتنے عالم میں ہیں محتاج وگدا، شاہ ووزیر
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشامد کے اسیر
تو بھی واللہ بڑی بات یہ کہتا ہے نظیر

جوخوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
فرزند	بیٹا
شاہ	بادشاہ
غنی	مالدار
گدا	فقیر
خلق	مخلوق
تاثیر	اثر
مردوزن	مرداورعورت
طفل	بچہ
خرد	چھوٹا
کلاں	بڑا
اسیر	قید

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ خوشامد سے کون کون راضی ہوتے ہیں؟

۲۔ نظم ''خوشامد'' کس شاعر کی تخلیق ہے؟

۳۔ نظم کے مطابق کون لوگ محتاج رہتے ہیں؟

مختصر سوالات:

۴۔ ''خُر دوکلاں'' کے کیا معنی ہیں؟

۵۔ ''خوشامد کے اسیر'' سے شاعر کی کیا مُراد ہے؟

۶۔ ''عوامی شاعر'' کے نام سے کون مشہور ہیں؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ نظم ''خوشامد'' کی روشنی میں نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے

۸۔ نظم ''خوشامد'' کے ابتدائی دو بندوں کی تشریح کیجیے۔

اکبرالہ آبادی

سیّد اکبر حسین رضوی، اکبرالہ آبادی ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام تحصیل بارہ ضلع الہ آباد اُتر پردیش میں پیدا ہوئے اکبر کے والد سید تفضّل حسین اپنے وقت کے معروف صاحبِ علم اور ریاضی داں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اکبر چونکہ بچپن ہی سے ذہین تھے اس لیے انھوں نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اکبر اوّلاً نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں وکالت کی سند حاصل کرنے کے بعد اکبر منصف کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور ترقی کرتے ہوئے سیشن جج کے عہدے پر پہنچ کر ۱۹۰۵ء میں پینشن حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں عدالتی خدمات کے صلے میں حکومت نے اُنھیں ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازا۔ اسی سال یعنی ۱۹۰۷ء میں اکبرالہ آباد یونیورسٹی میں فیلو مقرر ہوئے۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو اکبر نے اپنے وطن الہ آباد میں وفات پائی۔

اکبر کو بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ وہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے مشرقی تہذیب کی شرافت کی حمایت اور مغربی تہذیب کی مذمت کی ہے۔ اصلاحِ معاشرت اکبر کی شاعری کا بنیادی مقصد تھا جس میں اُنھیں خاطر خواہ کامیابی ملی۔ انگریزی اور ہندی کے الفاظ کا استعمال کر کے اکبر نے اپنے کلام کو با اثر بنا دیا۔

اکبر نظم ''ایک شکایت'' میں بہ ظاہر اپنے بیٹے سید عشرت حسین سے مخاطب نظر آتے ہیں لیکن در پردہ وہ ہندوستان کے ہر بچے کی تربیت و اصلاح کرتے ہیں۔ اکبر نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ انگریزی تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ ہم ہندوستانی تہذیب و تمدن کو نظر انداز کر دیں۔ انگریزوں کی اندھی تقلید کے بجائے ہندوستانی نوجوانوں کو اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے جائز مقصد کی تکمیل کرنی چاہیے۔ بچوں کی تربیت نہیں کرنے والے اور دینِ خدا کی روش کو بھولے ہوئے عمر دراز لوگوں پر بھی اکبر نے اصلاحاً بھرپور طنز کیا ہے۔

اکبرالہ آبادی

ایک شکایت

اِعشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروانہ رہی
کیک کو چکھ کے سِوئیوں کا مزا بھول گئے

بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں
سایۂ کفر پڑا، نورِ خدا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

کیسے کیسے دلِ نازک کو دُکھایا تم نے
خبرِ فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے

بُخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو
کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے

نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جب کہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

لے سیدعشرت حسین (اکبر کے صاحب زادے)

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
اغیار	غیر کی جمع
روزِ جزا	حشر کا دن
بخل	کنجوسی
اہلِ وطن	وطن کے لوگ
جود وعطا	مہربانیاں
نقلِ مغرب	مغربی تہذیب کی نقل
نکتہ	وہ بات جو پوشیدہ ہو
روشِ دینِ خدا	خدا کے دین کا طریقہ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ نظم ''ایک شکایت'' میں شاعر نے کس سے شکایت کی ہے؟

۲۔ ''موم کی پُتلیاں'' کنہیں کہا گیا ہے؟

۳۔ کون گھر کی محبت کا مزا بھول گیا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ نظم ''ایک شکایت'' میں استعمال الفاظ اغیار، بُخل اور جود وعطا کے معنی لکھیے۔

۵۔ عشرتی سے شاعر اکبرالہ آبادی کا کیا رشتہ تھا؟

۶۔ شاعر اکبرالہ آبادی کی ''روشِ دینِ خدا'' سے کیا مراد ہے؟

تفصیلی سوالات

۷۔ نظم ''ایک شکایت پر تبصرہ کیجیے۔

۸۔ نظم ''ایک شکایت'' کے ابتدائی تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

علاّمہ اقبالؔ

شاعرِ مشرق علاّمہ شیخ محمد اقبالؔ کی ولادت ۹ رنومبر ۱۸۷۷ءکوسیال کوٹ (پنجاب) میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اقبالؔ کی ابتدائی تعلیم گھر کے علمی و مذہبی ماحول میں شروع ہوئی۔ مکتبی تعلیم کی تکمیل کے بعد مشن کالج سیال کوٹ میں داخلہ لیا جہاں مشرقی علوم کے استاد مولوی سید میر حسن سے اقبالؔ نے فیض حاصل کیا۔ ایف۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے کر بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ علاّمہ فارغ التحصیل ہو کر پہلے اورینٹل کالج لاہور اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے ۱۹۰۵ء میں اِنگلستان تشریف لے گیے، اور بارایٹ لا ءکی ڈگری حاصل کی۔ کیمبرج یونی ورسٹی نے آپ کو فلسفے میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند تفویض کی۔ ۱۹۰۸ء میں ہندوستان لوٹ کر وکالت شروع کی۔ ۱۹۲۳ء میں حکومتِ برطانیہ نے اُنھیں "سر" کا خطاب دیا۔ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ءکو لاہور میں آپ کا انتقال ہوا۔

روایت زمانہ کے مطابق علامہ اقبالؔ نے غزل گوئی سے شاعری کی ابتدا کی۔ اُن دنوں آپ نے مولوی سید میر حسن اور داغؔ دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ آگے چل کر علامہ نے غزل کے بجائے نظم کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ فلسفہ وعمل آپ کے کلام کے بنیادی عناصر ہیں۔ سوز و گداز، درد و اثر اور مطالعۂ کائنات نے علاّمہ کے کلام کو دوآتشہ بنا دیا ہے۔ آپ کے کلام کے اردو مجموعوں میں "بانگِ درا"، "ضربِ کلیم"، "بالِ جبریل" اور "ارمغانِ حجاز" قابلِ قدر ہیں۔

آپ کی قومی اور وطنی نظموں میں "ہمالہ"، "تصویرِ درد"، "قومی ترانہ" اور "نیا شوالہ" وغیرہ کا شمار

ہوتا ہے۔

نظم ''جگنو'' علاّمہ اقبالؔ کی نمائندہ نظموں میں شمار ہوتی ہے، اگر چہ یہ نظم اُنکی دیگر نظموں کے مقابلے مختصر ہے لیکن اس کی تاثیر اور اپیل قابلِ تعریف ہے۔ شاعر نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر چہ جگنو بھی ایک پتنگا ہے لیکن وہ پروانے کی طرح روشنی کا طالب نہیں ہوتا بلکہ بذاتِ خود روشنی کا پیکر ہوتا ہے۔ شاعر کا یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کو مختلف قسم کی خوبیوں اور اوصاف سے نوازا ہے۔ اگر انسان اِن خدا داد صلاحیتوں کا بھر پور استعمال کرے تو وہ کامیاب و کامران ہو کر ''اشرف المخلوقات'' کا درجہ صحیح معنوں میں حاصل کر سکتا ہے۔

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے ، آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا ، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو
گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چمک ہے

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

مشکل الفاظ اور ان کے معنی

الفاظ	معنی
کاشانۂ چمن	باغ کا احاطہ
انجمن	محفل
مہتاب	چاند
شب	رات
سلطنت	حکومت
سفیر	قاصد، ایلچی
غربت	وطن سے دوری
تکمہ	بٹن
قبا	لباس، پوشاک
پیرہن	لباس، پوشاک
پوشیدہ	چھپا ہوا، مخفی
خلوت	تنہائی
ظلمت	اندھیرا
گہن	گرہن، داغ، عیب

رنگیں نوا	میٹھی یعنی شیریں آواز والا
مرغانِ بے زبان	بے زبان پرندے
شجر	درخت، پیڑ
مخفی	پوشیدہ، چھپا ہوا
اختلاف	خلاف، فرق، تفاوت
پنہاں	پوشیدہ، مخفی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ نظم ''جگنو'' کس شاعر کی تخلیق ہے؟

۲۔ نظم ''جگنو'' میں استعمال لفظ ''مہتاب'' کے معنی لکھیے۔

۳۔ شاعر نے نظم ''جگنو'' میں ''روشنی کا طالب'' کسے کہا ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ ''آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۵۔ علامہ اقبالؔ نے جگنو اور پھول میں کون سے اوصاف بتائے ہیں؟

۶۔ شاعر کے مطابق کس چیز نے دھوکے دیے ہیں؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ نظم ''جگنو'' کے ابتدائی بند کی تشریح کیجیے۔

۸۔ نظم ''جگنو'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

جوشؔ ملیح آبادی

شاعرِ شباب وشاعرِ انقلاب شبیر حسن خاں جوشؔ کی ولادت ۱۸۹۴ء میں بمقام ملیح آباد ہوئی۔اُن کے والد محمد بشیر احمد خاں بشیرؔ اور دادا فقیر محمد خاں گویاؔ بھی اردو کے باکمال شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ جوشؔ کی تعلیم وتربیت روایتِ زمانہ کے مطابق گھر پر شروع ہوئی جہاں اُنھوں نے عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ جوشؔ تعلقہ داروں کے خاندان سے متعلق تھے اسی لیے اُنکی تربیت اسی ماحول میں ہوئی اور بقول عظیم الحق جُنیدی وہ ''سینئر کیمبرج سے زیادہ تعلیم نہ حاصل کر سکے۔البتہ ذاتی مطالعہ اور ذہانت نے بہت کچھ سکھا دیا۔'' جوشؔ تلاشِ معاش کے لیے مختلف شہروں میں گئے۔۱۹۲۱ء میں وہ کلکتہ پہنچے۔۱۹۲۴ء میں حیدرآباد کے دارالترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ناظر ادب مقرر ہوئے۔دس سال بعد دہلی پہنچ کر انھوں نے رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ پونہ اور بمبئی میں قیام کے دوران فلموں سے وابستگی رہی۔ کچھ عرصہ بعد ''آج کل'' دہلی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔۱۹۵۵ میں حکومت نے انھیں ''پدم بھوشن'' کا اعزاز عطا کیا۔۱۹۵۶ء میں جوشؔ پاکستان چلے گئے جہاں ترقی اردو لغت بورڈ کراچی میں اُردو لغت پر کام کرتے ہوئے ۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء کو کراچی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

جوشؔ نے رومانی و انقلابی نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ اُنکی نظموں میں مناظرِ فطرت کی عکاسی، جذبات نگاری، حُبّ الوطنی اور جذبۂ آزادی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انھیں الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات پر عبور حاصل تھا۔ جوشؔ کے مجموعۂ کلام ''روحِ ادب''، شعلہ و شبنم''، ''حرف و

حکایت'' اور ''جنون وہوش'' وغیرہ منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

زیرِ نظر انتخاب میں شامل جوشؔ کی نظم ''ٹھنڈی اُنگلیاں'' ایک مفلس و نادار باپ کی رودادِ حیات ہے۔ جو اپنے معصوم بچے کی معمولی سی فرمائش بھی پوری نہیں کر پاتا۔ بچہ ایک کھلونے کے لیے ضد کرتا ہے اور بالآخر اس کی اُنگلیاں سرد ہو جاتی ہیں اور باپ زار و قطار رونے لگتا ہے۔ یہ نظم غریبی و ناداری کی عکاسی کرتی ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی

ٹھنڈی انگلیاں

سرد انگلی اپنے مفلس باپ کی پکڑے ہوئے
رو رہا ہے ایک بچہ اک دکاں کے سامنے

اک کھلونے طرف اُنگلی اٹھا کر بار بار
کچھ نہیں کہتا ہے لیکن رو رہا ہے زار زار

باپ کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے دنیا سیاہ
رُخ پہ گردِ مفلسی ہے، جیبِ خالی پر نگاہ

دل ہوا جاتا ہے بچے کے بلکنے سے فگار
کہہ رہا ہے زیرِلب ''فریاد اے پروردگار!''

واہ کیا تقدیر ہے اس بندۂ مظلوم کی
ہو چلی ہیں اُنگلیاں ٹھنڈی مرے معصوم کی

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
مفلس	غریب، نادار
سرد	ٹھنڈی، ٹھنڈا
زار زار	لگاتار، مسلسل
سیاہ	کالا، تاریک
رُخ	چہرہ
گردِ مفلسی	غریبی کی دھول، یعنی غربت
بِلکنا	زورزور سے رونا
فِگار	زخمی
بندۂ مظلوم	وہ شخص جس پر ظلم ہوا ہو

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ ''شاعرِ انقلاب'' کے نام سے کون شاعر مشہور ہے؟

۲۔ نظم ''ٹھنڈی اُنگلیاں'' کس کی تخلیق ہے؟

۳۔ بچہ کیوں رو رہا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ نظم ''ٹھنڈی اُنگلیاں'' میں بندۂ مظلوم کسے کہا گیا ہے؟

۵۔ نظم ''ٹھنڈی اُنگلیاں'' کے مطابق مفلس باپ کی حالت کیسی تھی؟

۶۔ ''مُفلس'' اور ''فِگار'' الفاظ کے معنی تحریر کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ نظم ''ٹھنڈی اُنگلیاں'' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

۸۔ جوشؔ کی نظم نگاری کی چند خصوصیات واضح کیجیے۔

شاہداختر خان

مثنوی: ایک تعارف

مثنوی اردو کے جملہ اصنافِ سخن میں اپنا منفرد اور یکتا مقام رکھتی ہے۔قصیدہ کی شان وشکوہ، مرثیہ کا رنج والم ،غزل کی رنگینی اور سوز وگداز سب ہی کچھ مثنوی میں پایا جاتا ہے۔اردو کی ہر صنفِ سُخن کسی مخصوص موضوع یا مقصد کیلئے وقف سی ہوکر رہ گئی ہے۔قصیدہ مدح یا مذمّت تک ،مرثیہ واقعاتِ کربلا تک اورغزل بھی اکثر محبوب کی زلف و رخسار میں الجھی رہی لیکن مثنوی ایسی صنفِ سخن ہے جس میں تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات مجموعی طور پر موجود ہیں۔مثنوی اشعار کے اس سلسلہ کا نام ہے جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ رہتی ہیں جن کا آپس میں ربط قائم رہتا ہے۔

مثنوی کے معنی دودو کیا گیا ہیں کیونکہ اس میں ہر شعر کا قافیہ اور ردیف دوسرے شعر کے قافیہ اور ردیف سے الگ ہوتا ہے۔اس میں عموماً کوئی تاریخی واقعہ یا عشقیہ داستان بیان کی جاتی ہے۔مثنوی کا مضمون مسلسل ہوتا ہے۔اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے یہ چونکہ طویل ہوتی ہے اسلئے اس میں قصّہ شروع کرنے سے پہلے حمد،نعت،مناجات اور بادشاہِ وقت کی تعریف ہوتی ہے،اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔قصہ کے دوران منظر کشی،رسم ورواج،لباس وزیور،اقسامِ خوردونوش،قومی بودوباش،تہذیب وتمدن کا ذکر،پندونصائح وغیرہ اور خاص وعام کے جذبات بہت دلنشیں انداز میں نظم کئے جاتے ہیں۔

اردو کی جملہ اصنافِ سخن کی طرح مثنوی بھی پہلے دکن میں پروان چڑھی اور بعد میں شمالی ہند میں عروج کی منازل طے کیں۔

اردوادب میں میر حسؔن کی مثنوی ''سحر البیان'' دیاشنکر نسؔیم کی مثنوی ''گلزارِنسیم'' مرزا شوقؔ کی مثنوی ''زہرِ عشق'' اور حفیظؔ جالندھری کی ''شاہنامۂ اسلام'' اپنی خصوصیات کی وجہ سے مشہور ومقبول ہیں۔

نواب مرزا شوقؔ

شوقؔ کا اصل نام تصدُّق حسین خاں اور عرفیت نواب مرزا تھی۔ ۱۷۸۰ء میں لکھنو کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ انکے والد آغا علی لکھنؤ کے مشہور حکیم تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر علوم مروجہ کی تحصیل کے ساتھ طب میں بھی مہارت حاصل کی۔ مگر ایک خوشحال اور دولت مند گھرانے کا فرد ہونے کی وجہ سے ذریعۂ معاش کی ان کو کوئی فکر نہ تھی۔

شوقؔ نہایت خوش مذاق اور بذلہ سنج تھے۔ لکھنؤ کے شرفاء کی محفل میں انکی خاصی پذیرائی تھی۔ نواب واجد علی شاہ نے انھیں اپنے مقربین میں شامل کر کے پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا اور بیش قیمت انعام واکرام سے بھی نوازا۔

شوقؔ نے جس زمانہ میں ہوش سنبھالا اس زمانہ میں لکھنو میں شاعری کا چرچا گھر گھر تھا۔ اسلئے ان کو بھی شعر وسخن کا ذوق پیدا ہوا اور انھوں نے آتشؔ کی شاگردی اختیار کی اور غزل گوئی شروع کر دی۔ شوقؔ کی اس زمانہ کی غزلوں میں کوئی خاص بات اور جدت نہیں ہے بلکہ ایک پھیکا پن پایا جاتا ہے اسلئے شوقؔ نے غزل کو چھوڑ کر مثنوی کے میدان میں قدم رکھا۔

شوقؔ نے سب سے پہلے مثنوی ''فریبِ عشق''، لکھی جو لکھنؤ کی رنگین اور عیش پسند سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اسکے بعد ''بہارِ عشق'' نے جادو جگایا اور آخر عمر میں مثنوی ''زہرِ عشق''، لکھی جو اپنی گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے آج بھی مقبولِ خاص وعام ہے۔

شوقؔ نے ۹۱ سال کی عمر میں ۱۸۷۱ء میں اس دارِفانی سے کوچ کیا۔

خصوصیاتِ کلام:۔ میرحسنؔ اور دیا شنکر نسیمؔ کے طرز کے برخلاف شوقؔ نے اپنی مثنویوں میں

حقیقت اور واقعہ نگاری پر خاص توجہ مرکوز کی اور مافوق الفطرت عناصر کے ذکر سے دامن بچایا ہے۔ چونکہ فطری جذبات نگاری اور سوز و گداز انکی مثنویوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اسلئے اثر آفرینی بہت بڑھ گئی ہے۔ تصنع اور مبالغہ آمیزی سے شوؔق کا دامن بالکل پاک ہے۔ شوؔق کی زبان بہت صاف ستھری اور سلیس ہے۔

زیرِ نظر مثنوی ''سرائے فانی'' میں شاعر نے دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا ذکر بہت پُر اثر اور خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

نواب مرزا شوقؔ

سرائے فانی

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ ناگہانی ہے

اونچے اونچے مکان تھے جنکے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نِشاں تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نِشاں باقی

غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم

کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام
کو ن سی گور میں گیا بہرام

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی انکے خاک ہوئے

تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی ان کا نہیں نِشانِ قبور

تاج میں جنکے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں　　کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ　　نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے　　باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان　　پڑھتے ہیں کلُّ من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
سرائے فانی	دنیا
جا	جگہ
عبرت	نصیحت
مورد	اُترنے کی جگہ
مرگِ ناگہانی	اچانک موت
گور	قبر
شگوفہ	کلی
آشیانۂ بوم	اُلّو کا گھونسلا
صاحب نوبت ونشاں	اعلیٰ مرتبہ لوگ
غیرت	شرم
رشکِ حور	خوبصورت عورتیں
مہ جبیں	چاند جیسی پیشانی والی
غیرتِ حور مہ جبیں	بہت زیادہ حسین
اقلیم	مُلک
مکیں	رہنے والے

رستگاری	نجات، چھٹکارا
بادشاہِ ہفت اقلیم	سات ملکوں کا بادشاہ یعنی بہت بڑا بادشاہ، شہنشاہ
رستم	ایران کے ایک مشہور پہلوان کا نام
سام	رستم کا باپ
فرق	پیشانی، تاج
خودسر	سرکش، نافرمان، باغی
استخواں	ہڈّی
قیصر	روم کے بادشاہوں کا لقب
فغفور	چین کے بادشاہوں کا لقب
کاسۂ سر	کھوپڑی
منقلب	اُلٹا، اوندھا
شیریں	ایران کی ایک خوبصورت عورت
کوہ کن	شیریں کا عاشق، فرہاد، پہاڑ توڑنے والا
نل و دمن	راجہ نل اور دمینتی
طائران	طائر کی جمع، پرندے
خوش الحان	اچھی اور سریلی آواز والا
کُل من علیھا فان	سب کو ایک دن مرنا ہے

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ مورِ دِمرگِ ناگہانی سے کیا مراد ہے؟

۲۔ بلبلوں کا ہجوم کہاں تھا؟

۳۔ صبح کو پرندے کیا پڑھتے ہیں؟

مختصر سوالات:

۴۔ اس نظم میں شاعر نے کس کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے؟

۵۔ جائے عبرت کے کیا معنی ہیں؟

۶۔ کُل من علیھا فان کے کیا معنی ہیں؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ اس نظم کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھئے۔

۸۔ مرزا شوقؔ کے کلام کی چند خصوصیات بیان کیجیے۔

منشی دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی

منشی دُرگا سہائے سرورؔ ۱۸۷۳ء میں قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ اُنکے والد حکیم پیارے لال قصبہ کے رئیس اور سر برآوردہ لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ زمینداری اور طبابت ذریعہ معاش تھی۔ سرورؔ نے ابتدائی تعلیم مدرسے اور قصبہ کے اسکول میں حاصل کی، انگریزی کی استعداد بطور خود بہم پہنچائی اور فارسی کی کتابیں سیّد کرامت حسین بہارؔ سے پڑھیں اور انہی سے شاعری میں اصلاح لینا شروع کر دیا لیکن بعد میں حضرت بیان یزدانیؔ کو اپنا اُستاد مان کر انکی اتباع کرنے لگے۔ کچھ عرصہ تک رسالہ زمانہ کانپور کے دفتر میں ملازمت کی لیکن بعد میں وطن جا کر طبابت کرنے لگے مگر اس فن کو ذریعۂ معاش قرار نہیں دیا۔

سرورؔ نہایت خوش خُلق انسان تھے۔ مہمان نوازی، راست گفتاری اور نیک طینتی ان کے کردار کی نمایاں خوبیاں تھیں۔ اہلیہ اور اکلوتے بیٹے کی اچانک موت نے انھیں دنیا سے دل برداشتہ کر دیا اور اسی غم میں ۳؍دسمبر ۱۹۱۱ء کو صرف ۳۷؍سال کی عمر میں جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی۔

خصوصیاتِ کلام: گو مولانا محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ نیچرل شاعری کے موجد مانے جاتے ہیں لیکن سرورؔ نے بھی اس میدان میں خوب خوب جوہر دکھائے ہیں اور کمال پیدا کیا ہے۔

سرورؔ کے یہاں تخّیل کی تازگی و شگفتگی، جذبات اور وارداتِ قلبی کی فراوانی اور مضامین کا تنوّع بڑے خاصے کی چیز ہیں، فارسی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بہت دلآویز ہے۔ ان کی شاعری میں جوش، طبیعت میں سوز و گداز اور تاثیر پائی جاتی ہے۔

زیرِ نظر نظم ''سیتا جی کی گریہ وزاری'' میں سرورؔ نے مشرقی عورت کی اپنے شوہر سے وفاداری، فرمانبرداری اور خدمت گذاری کے جذبے کی بہترین عکّاسی کی ہے۔

منشی دُرگا سہائے سرورؔ

سیتا جی کی گریہ وزاری

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ناتھ لے چلو
ریکھا تمھارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو

نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا
چھوٹا تمہارا ساتھ تو جی چھوٹ جائے گا

قسمت نے جب سے باپ کے گھر سے جدا کیا
سوامی ! مجھے تم نے نظر سے جد ا کیا

پتلی کی طرح آنکھوں میں شام و سحر رہی
پہلو میں بن کے صبر و شکیبِ جگر رہی

دکھ آج تک سہا نہ غمِ اِنتظار کا
مجھ پر کرم رہا ستم روزگار کا

مجھ سے شبِ فراق میں تڑپا نہ جائے گا
روزِ سیاہ ہجر کا دیکھا نہ جائے گا

صدمے تمہارے ہجر کے کیوں کر اٹھاؤں گی
میں مرمٹوں گی دکھ جو یہ دم بھر اٹھاؤں گی

گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو
پاؤ گے بن سے آکے نہ جیتا غریب کو

مانا کہ دشت میں غم و آلام ہیں بہت
بن باسیوں کو دکھ سحر و شام ہیں بہت

ایذا اگر چہ آبلہ پائی کی ہے کڑی
دوزخ سے بڑھ کے آگ جدائی کی ہے کڑی

یہ آگ وہ ہے جو دلِ مضطر کو پھونک کر
بجھتی ہے آرزو کے بھرے گھر کو پھونک کر

تاریک تم بغیر ہے عالم مرے لئے
فردوس بھی ہے ایک جہنم مرے لئے

صحرا مجھے چمن ہے رفاقت میں آپ کی　　دنیا کے سارے عیش ہیں خدمت میں آپ کی
سوامی جو تم ہو ساتھ تو کیسا الم کدہ　　خس پوش جھونپڑا مجھے ہوگا صنم کدہ
سبزہ بنا کے لائے گا بستر مرے لئے　　جھولا جھلا نے آئے گی صرصر مرے لئے
صورت تمہاری دیکھ کے غم بھول جاؤں گی　　صحرا کے سارے رنج و الم بھول جاؤں گی

پلکوں سے راہ دشت کی جھاڑا کروں گی میں
داسی ہوں لے چلو مجھے سیوا کروں گی میں

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
ناتھ	مالک،شوہر
شکیب	صبر، برادشت
روزگار	زمانہ
شبِ فراق	جدائی کی رات
ہجر	جدائی
دشت	جنگل
ایذا	تکلیف
آبلہ پائی	پاؤں میں چھالے پڑنا
دلِ مضطر	بےچین دل
تاریک	اندھیرا،کالا
عالَم	دنیا
فردوس	جنت
صحرا	ریگستان، ویرانہ
رفاقت	ساتھ
الم کدہ	دکھ کا گھر

صنم کدہ	مندر، بت خانہ
صرصر	آندھی، جھکّڑ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ اس نظم کے شاعر کا نام بتایئے؟

۲۔ سیتا جی نے اپنا دل ٹوٹنے کی کیا وجہ بتائی ہے؟

۳۔ کون سی آگ دوزخ سے زیادہ کڑی ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ شاعر نے اس نظم میں کون سے واقعہ کا بیان کیا ہے؟

۵۔ سیتا جی رام چندر جی سے کیا التجا کرتی ہیں؟

۶۔ اس نظم میں مستعمل مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد بتایئے:

ہمراہ۔نازک۔فراق۔دوزخ

تفصیلی سوالات:

۷۔ اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۸۔ سرورؔ جہان آبادی کی مختصر سوانح تحریر کیجیے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں پر روشنی ڈالیے۔

شاہد اختر خان

مرثیہ: ایک تعارف

صنف مرثیہ عربی زبان سے فارسی اور فارسی سے اردو میں آئی۔ اصل میں مرثیہ عربی زبان کے لفظ رثاء سے بنا ہے جس کے لغوی معنی رونا اور ماتم کرنا ہوتے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی موت پر رنج والم کا اظہار کیا جائے اور مرنے والے کے اوصاف ومحاسن کو اس طرح بیان کیا جائے کہ سننے والے کو رحم آجائے لیکن اردو میں جب صرف مرثیہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے وہ نظم سمجھی جاتی ہے جس میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے اعزاء اور رفقاء کی شہادت کا بیان ہو۔ شہدائے کربلا کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا مرثیہ ہو تو شروع میں بطور عنوان اس کی وضاحت کر دینا لازمی ہے ایسے مرثیہ کو 'شخصی مرثیہ' کہا جاتا ہے مثلاً مرثیۂ عارف مرثیۂ داغؔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' (علاّمہ اقبالؔ) وغیرہ۔

مرثیہ کے لئے کوئی ہیئت یا فارم مخصوص نہیں ہے غزل، قطعہ، رباعی مسدّس کسی بھی فارم کو مرثیہ کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی دور میں بہت سے مرثیہ غزل کی شکل میں لکھے گئے مرزا غالبؔ نے عارف کا مرثیہ غزل کی شکل میں ہی لکھا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی ماں کا مرثیہ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' مثنوی کی فارم میں اور مولانا حالیؔ نے غالبؔ کا مرثیہ ترکیب بند کی شکل میں لکھا ہے۔ غرض تمام اقسامِ نظم میں مرثیہ لکھے گئے مگر پھر ضمیرؔ لکھنوی نے مرثیہ کے لئے صِنفِ مُسدّس کو مخصوص کر دیا۔

مرثیوں سے اردو میں رزمیہ شاعری کی جو کمی محسوس ہوتی تھی وہ پوری ہوگئی۔ اسکے علاوہ اخلاقی مضامین، منظر نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری، واقعہ نگاری اور روزمرّہ، محاورے، صنائع و بدائع، جدتِ بیان اور بہت سے نئے مضامین مرثیے میں داخل ہوکر اردو شاعری کی آبرو بن گئے۔ مرثیہ کے

حسبِ ذیل اجزا ہیں مگر ضروری نہیں کہ ہر مرثیہ میں یہ تمام اجزاء پائے جائیں۔

۱۔ **چہرہ**:۔اسے مرثیہ کی تمہید بھی کہتے ہیں تمہید کا موضوع مرثیہ کے اصل موضوع سے الگ ہوتا ہے۔

۲۔ **سراپا**:۔اس جُزو میں مرثیے کے ہیرو کے خدوخال، حسن و جمال، قد و قامت اور اُسکی دوسری بہت سی خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۳۔ **رخصت**:۔مرثیہ کے اس جزو میں ہیرو کا اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب سے میدانِ جنگ میں جانے کیلئے رخصت چاہنے کا ذکر ہوتا ہے۔

۴۔ **آمد**:۔اس حصہ میں ہیرو کے میدانِ جنگ کی طرف شان وشوکت سے بڑھنے اور پہنچنے کا بیان ہوتا ہے۔

۵۔ **رجز**:۔مرثیہ کے اس جزو میں ہیرو اپنے بزرگوں کے کارناموں، خاندانی تعلقات اور اپنی جنگی مہارت وغیرہ کو بیان کرتا ہے۔

۶۔ **جنگ**:۔اس حصہ میں میدانِ جنگ کے اندر ہونے والی لڑائی کا پورا نقشہ کھینچا جاتا ہے اور ساتھ ہی تلوار اور گھوڑے کی تعریف اور ہیرو کی شجاعت وغیرہ ذکر کیا جاتا ہے۔

۷۔ **شہادت**:۔حضرت امام حسینؓ اور انکے رفقاء کا دشمنوں نرغہ میں گھرنے، زخمی ہونے اور آخر میں جامِ شہادت نوش کرنے کا پُر اثر بیان مرثیہ کے اس حصّہ میں کیا جاتا ہے۔

۸۔ **بین**:۔شہادت کے بعد شہید کے اہل و عیال، عزیز و اقارب کے ذریعہ کی جانے والی گریہ وازاری، آہ وبُکا کی منظر کشی مرثیہ کے اس جزو میں کی جاتی ہے۔ذکرِ شہادت اور بین کی

کامیابی مرثیہ کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے۔

میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، میر ضمیرؔ، میر خلیقؔ وغیرہ نے مرثیہ کو بہت زیادہ وسعت دی اور کمال تک پہنچایا ان کے علاوہ حالیؔ، مومنؔ، غالبؔ، چکبستؔ اور جوشؔ وغیرہ نے بھی مرثیہ لکھے ہیں۔

میر ببر علی انیسؔ

میر ببر علی انیسؔ ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انکے والد میر خلیقؔ نے نواب امجد علی شاہ کے زمانے میں فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انیسؔ نے لکھنؤ میں ہی تربیت پائی اور شعر گوئی کا فن یہیں اپنے والد سے سیکھا۔ انیسؔ کا رجحان شروع سے ہی مرثیہ گوئی کی طرف تھا۔ لکھنؤ کے ادبی ماحول میں اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی اور اس فن کو بلندی کی انتہا تک پہنچا دیا اپنی جودتِ طبع کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کا نام شعر و سخن کی دنیا میں عظمت کا نشان بن گیا۔ انیسؔ نے بے جان صنف کو حرکت دی اور اپنے زورِ بیان سے مرثیہ میں تلاطم اٹھایا جو آج بھی صفحۂ قرطاس پر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ بقول مولانا محمد حسین آزادؔ انیسؔ نے مضامین کی ایجاد کے دریا بہا دیے۔ ایک مقررہ مضمون کو سیکڑوں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ انیس نے تقریباً ڈھائی لاکھ اشعار کہے اور سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں گویا اردو شعر و ادب میں ان سے بڑھ کر قادر الکلام شاعر کوئی نہیں ہوا اور ایسا بھی کوئی نہیں جس نے محدود و مقید صنف سخن کو لے کر فلسفۂ حیات کی جزئیات کو بیان کیا ہو۔ انیسؔ کے یہاں خیر و شر کا معرکہ نفسیاتی راہ سے اس طرح گذرتا ہے جس سے حیات و ممات کے مسائل پر کافی روشنی پڑتی ہے اور شاعری اعلیٰ مصوری کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ ہر ایک کے جذبات کو حفظِ مراتب کے لحاظ سے اس طرح نظم کرتے ہیں کہ ان کے کردار کی تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔ انیسؔ نے واقعاتِ کربلا پر بے شمار مرثیے کہے ہیں اور جو مناظر پیش کئے ہیں مختصر الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے ہیں گویا ان کو مناظرِ قدرت کے بیان میں کمال حاصل ہے۔ ۱۸۷۴ء میں انیسؔ نے اس عالمِ فانی کی طرف کوچ کیا۔

خصوصیاتِ کلام:۔

انیسؔ مرثیہ کے ممتاز شاعر تھے۔ میر انیسؔ کی زبان لکھنوی اسکول کی زبان ہے۔ ان کے بیان میں لطافت ونزاکت، محاورے کی صحت وصفائی، بندش کی چستی اور دل آویز الفاظ کا حسنِ انتخاب، محاکات ،مرقع نگاری غرض سبھی کچھ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انیسؔ نے اردو میں رزمیہ شاعری کی نہ صرف بنیاد ڈالی بلکہ اسے دوسری زبانوں کی رزمیہ شاعری کو آنکھیں دکھانے کے قابل بنادیا۔

میر ببر علی انیسؔ

مرثیہ

یارب !چمن نظم کو گلزار ارم کر　　اے ابر کرم!خشک زِراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے، تو جہ کوئی دم کر　　گم نام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک، یہ چمک، مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سُخن ، میرے قلم رو سے نہ جائے

اس باغ میں، چشمے ہیں ترے فیض کے جاری　　بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل بر و مند ہے، یا حضرت ِباری!　　پھل ہم کو بھی مل جائے ، ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت، چمن طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو، جن پھولوں کی بو کو

غوّاصِ طبیعت کو عطا کر ، وہ لآلی　　ہو جن کی جگہ ، تاجِ سر عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم ثریاّ سے ہو عالی　　عالم کی نگاہوں سے گرے ، قطب شمالی
سب ہوں دُریکتا ، نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کی یہ ہوں گے، جنھیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اِس دُرجِ دَہاں کو　　دریاے معانی سے بڑھا ، طبع رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو　　عاشق ہو فصاحت بھی ، وہ دے حسن بیاں کو
تحسیں کا ، سماوات سے غُل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

دُنیا بھی عجب گھر ہے، کہ راحت نہیں جس میں یہ گل ہے وہ گل ، بوئے محبت نہیں جس میں
یہ دوست ہے وہ دوست ، مروّت نہیں جس میں یہ شہد ہے وہ شہد ، حلاوت نہیں جس میں

بے دردو الم ، شام غریباں نہیں گزری
دنیا میں کسی کی ، کبھی یکساں نہیں گزری

گودی ہے کبھی ماں کی ، کبھی قبر کا آغوش گل پیرہن ، اکثر نظر آتے ہیں کفن پوش
سرگرمِ سُخن ہے کبھی انساں، کبھی خاموش گہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بہ سرِ دوش!

اک طور پہ دیکھا، نہ جواں کو نہ مسن کو
شب کو تو چھپر کھٹ میں ہیں، تابوت میں دن کو

شادی ہو کہ اندوہ ہو ، آرام ہو یا جور دنیا میں گذر جاتی ہے انساں کی بہ ہر طور
ماتم کی کبھی فضل ہے، عشرت کا کبھی دور ہے شادی و ماتم کا مرُقع جو کرو غور

کس باغ پہ آسیب خزاں آنہیں جاتا ؟
گل کونسا کھلتا ہے، جو مرجھا نہیں جاتا ؟

ہے عالم فانی کی عجب صبح، عجب شام گہ غم، کبھی شادی ، کبھی ایذا ، کبھی آرام
نازوں سے پلا فاطمہ زہرا کا گل اندام و احسرت و دردا ! کہ وہ آغاز یہ انجام !

راحت نہ ملی ، گھر کے تلاطُم سے دہم تک
مظلموم نے فاقے کیے ، ہفتم سے دہم تک

کس جنگ میں، سینے کو سپر کر کے نہ آئے؟ کس مرحلۂ صعب کو سر کر کے نہ آئے؟
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے؟ تھی کون سی شب، جس کو سحر کر کے نہ آئے؟
تھا کون ، جو ایماں تہ صمصام نہ لایا ؟
اُس شخص کا سر لائے ، جو اسلام نہ لایا

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرّار کی تلوار ؟ کس شیر کے قبضے میں ہے کرّار کی تلوار؟
دریا نے بھی دیکھی نہیں ، اس دھار کی تلوار بجلی کی تو بجلی ہے یہ تلوار کی تلوار
قہر و غضب اللہ کا ہے، کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اسے موت کا گھر، گھاٹ نہیں ہے

دم لے کہیں رُک کر، وہ روانی نہیں اس میں چلنے میں سُبک تر ہے، گرانی نہیں اس میں
جُز حرفِ ظفر ، اور نشانی نہیں اس میں جل جاؤ گے سب، آگ ہے، پانی نہیں اس میں
چھوڑے گی نہ زندہ اُسے، جو دشمن دیں ہے
نابیں نہیں، غصے سے اجل چیں بہ جبیں ہے

سب قطرے ہیں، گر فیض کے دریا ہیں تو ہم ہیں ہر نُقطۂ قرآں کے، شناسا ہیں، تو ہم ہیں
حق جس کا ہے جامع، وہ ذخیرا ہیں، تو ہم ہیں افضل ہیں تو ہم عالم و دانا ہیں، تو ہم ہیں
تعلیم مَلَک ، عرش پہ تھا ورد ہمارا
جبریل سا استاد ، ہے شاگرد ہمارا

گر فیض ظُہور شہ لولاک ، نہ ہوتا　　بالائے زمیں ، گنبدِافلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں، بہ جز خاک نہ ہوتا　　ہم پاک نہ کرتے ،تو جہاں پاک نہ ہوتا
یہ شور اَذاں کا ، سحر و شام کہاں تھا ؟
ہم عرش پہ جب تھے،تو یہ اسلام کہاں تھا ؟

ہے ہے !پسرِصاحبِ معراج ، حسینا!　　پر دیس میں بیووں کا لُٹا راج، حُسینا!
گویا کہ علی قتل ہوئے آج ،حسینا!　　ہے ہے ! کفن و گور کے محتاج، حسینا!
پُر سا بھی ، ترادینے کو آتا نہیں کوئی
لاشا بھی، زمیں پر سے اُٹھا تا نہیں کوئی

اے میرے شہید، اے مرے ماں جائے برادر!　　کس سے تیرا لاشہ بہن اُٹھوائے برادر؟
کس طرح مرے دل کو قرار آئے برادر ؟　　پانی بھی نہ قاتل نے دیا، ہائے برادر !
انساں پہ ستم یوں کبھی انساں نہیں کرتا
حیواں کو بھی پیاسا ،کوئی بے جاں نہیں کرتا

خاموش انیسؔ! اب کہ ہے دل سینے میں بے چین　　لکھے نہیں جاتے ہیں، جو زینب نے کیے بین
اب حق سے دُعا مانگ، کہ اے خالقِ کونین!　　حاسد ہیں بہت ، دل کو عطا کر مرے تو چین
ناحق ہے عداوت اُنھیں، اس ہیچ مداں سے
بے تیغ کٹے جاتے ہیں، شمشیر زباں سے

مشکل الفاظ اور انکے معنی

الفاظ	معنی
اِرم	جنت
قلمرو	حکومت
ثریّا	تاروں کا جھرمٹ
سمک	مچھلی کنایتاً سمندر کی تہہ
گہ	کبھی
صمصام	تیز تلوار
مبدا	سرچشمہ
برومند	پھلدار
اندوہ	رنج وغم
شہِ لولاک	حضرت محمد ﷺ
اعجاز بیاں	جادو بیاں
ریاضت	محنت
قطب	ایک تارے کا نام
کانِ ملاحت	نمک کی کھان
مُسن	عمر رسیدہ

سپر	ڈھال
پرتو	عکس، سایہ
طبعِ نکو	اچھی طبیعت
دریکتا	بے مثل موتی
شامِ غریباں	پردیسیوں کی شام
مرحلۂ صعب	دشوار منزل
ہیچ مداں	بے علم، ناچیز
اقلیم	ملک
غوّاص	غوطہ خور
دُرج	پٹاری، ڈبیا

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ شہِ لولاک کسے کہا جاتا ہے؟

۲۔ قُطب کس سمت کو بتاتا ہے؟

۳۔ صمصام کے کیا معنی ہیں؟

مختصر سوالات:

۴۔ ع ''کس شیر کے قبضے میں ہے کرّار کی تلوار'' اس مصرع میں 'کرّار' سے کون مراد ہیں؟

۵۔ ''ناحق ہے عداوت انھیں اس ہیچ مداں سے بے تیغ کٹے جاتے ہیں شمشیرِ زباں سے''
اس شعر میں لفظ 'ہیچ مداں' کس کے لیے استعمال کیا گیا ہے؟

۶۔ اس مرثیہ کے پہلے بند کا مطلب لکھیے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ مرثیہ کسے کہتے ہیں؟ مرثیہ کی مختصر تاریخ اور اجزاے ترکیبی بتائیے۔

۸۔ میر انیسؔ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ان کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ

مرزا سلامت علی دبیرؔ ۱۸۰۳ میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد مرزا غلام حسین دہلی سے لکھنؤ چلے آئے اس طرح دبیرؔ بچپن میں ہی لکھنؤ آ گئے اور یہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ کچھ دن کے بعد مشاعروں میں شامل ہونے لگے اور میر ضمیرؔ کی شاگردی اختیار کی اور اتنا نام پیدا کیا کہ استاد کو پیچھے چھوڑ گئے۔ مرثیہ کو اپنا خاص فن بنایا۔ اپنے استاد میر ضمیرؔ کی طرح مرثیہ گوئی میں چند عنوانات قائم کر کے چار چاند لگا دیئے اور اپنے استاد کی قائم کردہ عمارت کو اور بلند و روشن کر دکھایا۔ جب ان کی شہرت کا ستارہ زیادہ بلند ہوا تو دربارِ اودھ کی سرپرستی حاصل ہوگئی اور مرزا دبیرؔ کو اپنے فنّی جوہر دکھانے کا اور بھی موقع ملا۔ انھوں نے تقریباً تین ہزار مرثیے کہے ہیں رباعی اور سلام وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۸۷۵ء میں وفات پائی۔

خصوصیاتِ کلام: مرزا دبیرؔ چونکہ ایک بڑے ذی علم انسان تھے اسلئے ان کے کلام میں بھی ایک علمی شان پائی جاتی ہے۔ الفاظ کا شکوہ، ترکیبوں کی فارسیت اور معنی آفرینی اُنکے کلام کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ ذوقؔ کی طرح ان کے کلام میں بھی آورد پایا جاتا ہے مگر بے نمکی نہیں ملتی ہے۔ دبیرؔ کے یہاں نازک خیالی کے ساتھ ساتھ تخیّل کی بلندی، مضمون آفرینی تشبیہ اور استعارہ کی ساری خوبیاں، مبالغہ اور بہت سے دوسرے شاعرانہ محاسن پائے جاتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ نے واقعات کربلا کے مناظر پر بہت زور دیا ہے لیکن اس میں اختصار پیدا نہیں کر سکے اور مرثیوں کو اتنا طول دے دیا کہ شاعرانہ لطافت اور ذہنی کاوش کو بلندی کا درجہ نہ دے پائے اور اس وصف میں میر انیسؔ سے پیچھے رہ گئے۔ تاہم مرزا دبیرؔ مرثیہ کے استاد تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کا نام اردو شعر و ادب میں روشن رہے گا۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ

مرثیہ

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رُستم کا جگر، زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے　　سب ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے ، حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں ، سمیٹے ہوئے پر کو

خودفتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر　　کہتے ہیں انا العبد ، لرز کر صنمِ دیر
جاں غیر ہے تن غیر مکیں غیر مکاں غیر　　نے چرخ کا ہے دور نہ سیّاروں کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف سے مانندِ زمیں ہے
جز بختِ یزید، اب کوئی گردش میں نہیں ہے

بے ہوش ہے بجلی ، پہ سمندا نکا ہے ہشیار　　خوابیدہ ہیں سب، طالعِ عباس ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید ، علَم ان کا نمودار　　بے نور ہے منھ چاند کا ، رخ ان کا ضیا بار
سب جزو ہیں،کل رتبے میں کہلاتے ہیں عبّاس
کونین پیادہ ہیں، سوار آتے ہیں عبّاس

چمکا کے مہ و خور ، زرد نقرہ کے عصا کو　　سرکاتے ہیں پیر فلکِ پشتِ دوتا کو
عدل آگے بڑھا ،حکم یہ دیتا ہے قضا کو　　ہاں ، باندھ لے ظلم وستم و جور و جفا کو
گھر لوٹ لے ،بغض وحسد وکذب وریا کا
سر کاٹ لے ، حرص وطمع ومکر و دغا کا

ہے شور فلک کا ، کہ یہ خورشیدِ عرب ہے　　انصاف یہ کہتا ہے کہ چپ ! ترکِ ادب ہے
خورشیدِ فلک ، پر توعارض کا لقب ہے　　یہ قدرتِ رب قدرتِ رب قدرتِ رب ہے
ہر ایک ، کب اس کے شرف و جاہ کو سمجھے
اس بندے کو وہ سمجھے ، جو اللہ کو سمجھے

یوسف ہے یہ کنعاں میں، سلیماں ہے سبا میں　　عیسیٰ ہے مسیحائی میں ، موسیٰ ہے دعا میں
ایوب ہے یہ صبر میں یحییٰ ہے بُکا میں　　شبیر ہے مظلومی میں ، حیدر ہے وغا میں
کیا غم، جو نہ مادر نہ پدر رکھتے ہیں آدم
عبّاس سا ، دنیا میں پسر رکھتے ہیں آدم

تقدیر جورن میں شبِ ہفتُم اسے لائی　　خلوت میں اسے بات عمر نے یہ سنائی
در پیش ہے سادات سے ہم کو بھی لڑائی　　واں پنجتنی چند ہیں یاں ساری خدائی
اکبر کا ، نہ قاسم کا، نہ شبیر کا ڈر ہے
دو لاکھ کو اللہ کی شمشیر کا ڈر ہے

بادل کی طرح سے وہ گرجتا ہوا نکلا　　جلدی میں ، سلحِ جنگ کے سجتا ہوا نکلا
ہر گام، رہِ عمر کو تجتا ہوا نکلا　　اور سامنے نقّارہ بھی بجتا ہوا نکلا
غالب تھا تہمتن کی طرح اہلِ جہاں پر
دھنستی تھی زمیں پاؤں وہ رکھتا تھا جہاں پر

تیار کمر کس کے ہوا جنگ پہ خوں خوار　　اور پیکِ اجل آیا، کہ ہے قبر بھی تیار
خنجر لیا منھ دیکھنے کو ، اور کبھی تلوار　　مثلِ ورم مرگ چڑھا گھوڑے پہ اک بار
وہ رخش پہ ، یا دیودنی تختِ زری پر
غل رن میں اٹھا کوہ چڑھا کبکِ دری پر

اسکے قدمِ پاک کا فدیہ ہے ، سراپنا　　قربان کیا جس پہ ، نبی نے پسر اپنا
نذرِ سرِ اکبر ہے دل اپنا جگر اپنا　　بیتُ الشرف شاہ پہ ، صدقے ہے گھر اپنا
مشہور جو عباس زمانے کا شرف ہے
شبّیر کی نعلین اٹھانے کا شرف ہے

شبیر کو ، بڑھ بڑھ کے نقیبوں نے پکارا　　لو ٹوٹتا ہے دستِ زبر دست تمہارا
ہے مرحبِ عبدا لقمر اب معرکہ آرا　　شبیر ! یقیں جانو کہ عباس کو مارا
یہ گرگ وہ یوسف، یہ خزاں ہے وہ چمن ہے
وہ چاند، یہ عقرب ہے وہ سورج یہ گہن ہے

غُل ہے کہ دلِ آلِ عبا توڑے گا مرحب　　اب بازوئے شاہِ شہدا توڑے گا مرحب
بندِ کمرِ شیرِ خدا توڑے گا مرحب　　گوہر کو تہِ سنگِ جفا توڑے گا مرحب
مرحب کا، نہ کچھ اس کو توانائی کا ڈر ہے
فدوی کو چچا جان کی تنہائی کا ڈر ہے

یہ غُل تھا جو مولا لیے مشک و علم آئے　　خیمے میں کمر پکڑے ، امامِ اُمم آئے
اور گر دِ علم ، بال بکھیر ے حرم آئے　　زینب سے کہا شہ نے بہن! لُٹ کے ہم آئے
بھائی کے یتیموں کی پر ستار ہو زینب
تم مہتمِ سوگِ علم دار ہو زینب

زینب نے کہا ہیں مری قسمت کے یہی کام　　دینے لگی ماتم کے سیہ جوڑے وہ ناکام
فِضّہ سے کہا سوگ کا کرتی ہوں سرانجام　　ٹھنڈا ہوا ہَے ہَے ! علَم لشکرِ اسلام
زہرا کا لباس اپنے لئے چھانٹ رہی ہوں
عباس کا ملبوسِ عزا بانٹ رہی ہوں

پھر زیر علم فرشِ سیہ لاکے بچھا یا　　اور بیوۂ عباس کو خود لا کے بٹھا یا
جتنے تھے سیہ پوش، انھیں رو کے سنا یا　　قسمت نے جواں بھائی کا بھی داغ دکھایا
ناسور نہ کس طرح سے ہو دل میں جگر میں
ماتم ہے علم دار کا سردار کے گھر میں

خاموش دبیرؔ اب کہ نہیں نظم کا یارا　　مدّاح کا دل خنجر غم سے ہے دو پارا
کافی پئے بخشش ، یہ وسیلہ ہے ہمارا　　اک ہفتے میں تصنیف کیا مرثیہ سارا
تجھ پر کرمِ خاص ہے ، یہ حق کے ولی کا
یہ فیض ہے سب مدحِ جگر بندِ علی کا

مشکل الفاظ اور اس کے معنی

الفاظ	معنی
انا العبد	میں بندہ ہوں
سلح جنگ	جنگ کے ہتھیار
فدیہ	صدقہ
تجنا	چھوڑنا
سمند	گھوڑا
تہمتن	رستم کا لقب، بہادر آدمی
ورم	سوجن
گُرگ	بھیڑیا
وغا	لڑائی
دیودنی	نیچ
مہتم	اہتمام کرنے والا
سبا	ایک ملک کا نام
کُبکِ دری	پہاڑی چکور
ٹھنڈا ہونا	ٹوٹنا، بے جان ہونا

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ رستم کا تعلق کس ملک سے تھا؟

۲۔ حیدر کے لقب سے کون مشہور ہیں؟

۳۔ حضرتِ زینب کا امام حسین سے کیا رشتہ تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ پنجتنی سے کون کون لوگ مراد ہیں؟

۵۔ اہم شہدائے کربلا کے نام بتایئے؟

۶۔ دبیرؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ اس مرثیہ کے ابتدائی دو بندوں کی تشریح کیجیے۔

۸۔ مرزا دبیرؔ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ان کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

سریع مطالعہ

محمد صادق

اردو میں مختصر افسانہ کی روایت

افسانہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی قصّہ یا کہانی کے ہیں۔قصّہ اور کہانی کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رہی ہے۔انسان کی ترقی میں اس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے زندگی کی دشواریوں اور پریشانیوں میں ایک خوش گوار فضا پیدا کی ہے۔مجنوں گورکھپوری کے مطابق:

''افسانہ،افسانہ ہے اور اس کی غایت جی بہلانا اور تکان دور کرنا ہے۔''

انسان کی شخصی،سماجی اور اقتصادی زندگی کے اچھے برے پہلوؤں کی عکاسی افسانوی ادب میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ان قصوں کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ اخلاقیت کا رجحان ان میں جابجا نمایاں ہے۔ایک فلسفی کا قول ہے کہ:

''دنیا نے آج جتنے بھی اخلاقی سبق سیکھے ہیں وہ قصّے، کہانیوں، حکایت اور تمثیل کے پیرائے میں سیکھے ہیں کیوں کہ براہ راست نصیحت کی باتیں سیکھنے سے انسان قاصر رہتا ہے۔''

جیسا کہ اس کے نام مختصر افسانہ سے ظاہر ہے کہ اس میں اختصار ہونا ضروری ہے۔مختصر افسانہ میں ناول کی سی تفصیل نہیں ہوتی بلکہ یہ زندگی کے کسی ایک رخ یا گوشہ کو اجاگر کرتا ہے۔ایک مغربی ادیب کے مطابق:

''افسانہ ایک ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔''

اردو میں قصّہ کہانی کی روایت بہت پرانی ہے لیکن جہاں تک مختصر افسانہ کا تعلق ہے زیادہ تر نقاد اور محققین کے مطابق یہ مغربی یا انگریزی ادب سے اردو ادب میں داخل ہوا ہے۔عبادت بریلوی کے مطابق:

''اردو افسانے کی روایت میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس کے
باعث مختصر افسانہ فطری طور پر رائج ہوتا۔اس کا بیج یہاں کی ادبی
زمین میں نہیں پھوٹا بلکہ مغرب سے اس کا پودا لا کر لگایا گیا۔''

اس طرح مختصر افسانہ انگریزی ادب کی short story کا ہی اردو ترجمہ ہے۔

افسانہ کے اجزائے ترکیبی:-

۱۔	پلاٹ	۲۔	کردار
۳۔	نقطۂ نظر	۴۔	ماحول اور فضا
۵۔	اسلوب و تکنیک	۶۔	اختتام

اس کے علاوہ کچھ نقاد نے وحدتِ تاثّر کو بھی مختصر افسانہ کا ایک اہم جزو مانا ہے۔

مختصر افسانہ کا ارتقا

اردو میں مختصر افسانہ کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔اس سے پہلے اردو کا نثری سرمایہ داستان اور ناول کی شکل میں موجود تھا۔اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند مانے جاتے ہیں۔پریم چند نے اپنے افسانوں میں خیالی دنیا کے بجائے حقیقی دنیا کا نقشہ کھینچا۔انہوں نے قصّہ اور کہانی جو خواص اور شہروں تک محدود تھی کو عوام اور دیہات کی زندگی کا ترجمان بنایا۔ پریم چند کا اور اردو کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ہے جو ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا اور پریم چند کا افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوزِ وطن' ہے جو ۱۹۰۸ء میں

شائع ہوا۔ پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعہ پہلی بار کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کو ادب میں پیش کیا۔ پریم چند کی نمائندگی کرنے والوں میں پنڈت سدرشن، اعظم کریوی، علی عبّاس حسینی، حیات اللہ انصاری، اپندر ناتھ اشک کے نام اہم ہیں۔

افسانے کے بانیوں میں سجاد حیدر یلدرم کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ لیکن جہاں پریم چند کے افسانے حقیقی زندگی کی تصویر پیش کر رہے تھے وہی یلدرم کے افسانوں میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ عورت اور اس کی محبت ہی ان افسانوں کا موضوع تھا۔ یلدرم کی نمایندگی کرنے والوں میں سلطان حیدر جوش، ل۔ احدا کبرآبادی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں باغیانہ افسانوں کا مجموعہ 'انگارے' کے نام سے شائع ہوا جس میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔ اس مجموعہ میں موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے افسانوی ادب میں نئے تجربے کیے گیے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے کسانوں اور مزدوروں کے حقوق و مسائل کو ادب میں پیش کیا اور بیداری اور آزادی کے جذبات کو بھی ابھارا۔ ساتھ ہی اس دور میں متوسط طبقہ اور عورتوں کے مسائل بھی افسانہ میں پیش کیے گیے۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، دیویندر ستیارتھی، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر اور بلونت سنگھ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور پھر ملک کا بٹوارا ہو گیا۔ چاروں طرف فسادات ہوئے تو افسانہ نگار بھی اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار افسانوں کے ذریعہ کیا۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس اردو افسانہ کا ایک نیا دور شروع ہوا جسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اس دور میں علامتی افسانے لکھے گئے۔ جدیدیت میں ترقی پسند تحریک کی طرح فرد کی خارجی زندگی میں انقلاب

نہیں آیا بلکہ اس کے ذہن، تخیل اور فکر میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی اور اس ذہنی انتشار کو ایک علامت کی شکل میں پیش کیا گیا۔ ان افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج مین را، اقبال متین، غیاث احمد گدّی، جوگندر پال، اقبال مجید کے نام سرِفہرست ہیں۔

جدیدیت کے بعد اردو افسانہ میں ایک بار پھر براہ راست اور اصلاح پسندی کا دور آیا لیکن آج کے دور میں پھر سے علامتی افسانے ہی لکھے جا رہے ہیں۔

پریم چند

منشی پریم چند وارانسی (بنارس) کے ایک گاؤں لمہی میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔اپنی ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے نواب رائے کے نام سے کیا۔ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی۔ثانوی تعلیم وارانسی سے مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔اسی دوران بی۔اے۔بھی کیا اور پھر ہیڈ ماسٹر اور ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز بھی رہے۔مہاتما گاندھی کے خیالات سے متاثر ہوکر 'عدمِ تعاون' کی تحریک کے زمانے میں انھوں نے ملازمت ترک کردی۔۱۹۳۶ء میں وارانسی میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

پریم چند کا اندازِ تحریر عام فہم ،سادہ اور سلیس ہے۔انہوں نے دیہاتی زندگی کی مشکلات اور مزدوروں اور کاشتکاروں کے جذبات واحساسات کو بخوبی پیش کیا ہے۔پریم چند کا بنیادی مقصد معاشرہ کی اصلاح ہے۔پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں انسانی زندگی کی سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے افسانے کے پلاٹ میں سادگی اور حقیقت کو قائم رکھا ہے اور جو کردار پیش کیے ہیں ان سے ہمیں سادگی،خلوص ومحبت،ایمانداری،سچائی،ایثار اور بھائی چارے کا پیغام ملتا ہے۔ان کے افسانے اسلوب اور ٹیکنک کے اعتبار سے مکمل ہیں۔

پریم چند کا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' کے نام سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا، جو اردو کا بھی پہلا افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔۱۹۰۸ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوزِ وطن' کے نام سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں عوام میں بیداری اور انقلاب پیدا کرنے والے افسانے ہونے کی وجہ سے انگریزی حکومت نے اسے ضبط کرلیا۔

'پریم پچیسی' 'پریم بتیسی' 'واردات' 'خواب وخیال' 'آخری تحفہ' 'سوزِ وطن' اور 'زادِراہ' ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد تقریباً چودہ ہیں۔پریم چند نے تقریباً بارہ ناول بھی لکھے جن میں 'غبن' 'میدانِ عمل' 'چوگانِ ہستی' 'گوشۂ عافیت' 'بازارِ حسن' 'بیوہ' اور 'گئودان' اہم ہیں۔

زیرِ نظر افسانہ 'نمک کا داروغہ' پریم چند کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔افسانے کے مرکزی کردار منشی بنسی دھر اور پنڈت الوپی دین ہیں۔منشی بنسی دھر ایک ایمان دار اور فرض شناس نمک کا داروغہ ہے جبکہ پنڈت الوپی دین تاجر اور ساہوکار ہے جو غیر قانونی طور سے نمک کی تجارت کرتا ہے۔اسی وجہ سے بنسی دھر اسے گرفتار کر لیتا ہے۔لیکن الوپی دین اپنی بے پناہ دولت اور رسوخ کے ذریعہ بری ہو جاتا ہے جب کہ بنسی دھر کو ملازمت سے معطّل کر دیا جاتا ہے۔لیکن ان سب کے باوجود اس افسانے کے آخر میں ایمان داری اور فرض شناسی کی جیت ہوتی ہے۔

منشی پریم چند

نمک کا داروغہ

(۱)

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا اور ایک خداداد نعمت سے فائدہ اُٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی تو لوگ دروازۂ صدر بند پا کر روزن و شگاف کی فکریں کرنے لگے، چاروں طرف خیانت اور غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹواری کا معزّز اور پُر منفعت عہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغۂ نمک کی برقندازی کرتے تھے اور اس محکمہ کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی تعلیم سند افتخار تھی۔ لوگ حسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قابل ہو جاتے تھے۔ منشی بنسی دھر نے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصّہ غم کو دریافت امریکہ یا جنگ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ سمجھانے لگے بیٹا! گھر کی حالتِ زار دیکھ رہے ہو۔ قرض سے گردنیں دبی ہوئی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں۔ نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمہیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا۔ یہ تو پیر کا مزار ہے۔ نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہئے۔ ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو، ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے، جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے اس لئے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لئے میں برکت ہوتی ہے اور تم خود عالم و فاضل ہو۔ تمہیں کیا سمجھاؤں۔ یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور

قیافے کی پہچان پر منحصر ہے۔انسان کو دیکھواس کی ضرورت کو دیکھو۔موقع دیکھواور خوب غور سے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی ار بے رُخی کر سکتے ہو۔لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے۔ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجّہ سے سُنیں۔اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔اس وسیع دُنیا میں جہاں اپنا استقلال، اپنا رفیق، اپنی ہمت، اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مرّبی ہے۔لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔خوبیٔ قسمت ساتھ تھی۔صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے۔مشاہرہ معقول، بالائی رقم کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے۔کلوار کو تسکین و تشفی کی سند ملی، پڑوسیوں کو حسد ہوا مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔

(۲)

جاڑے کے دن تھے اور رات کا وقت تھا، نمک کے برقنداز اور چوکی دار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے لیکن اسی عرصے میں ان کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کے اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی۔نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گذرگاہ بنی ہوئی تھی۔داروغہ صاحب کمرہ بند کئے میٹھی نیند سو رہے تھے۔یکا یک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شور وغل اور ملاّحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں اُٹھ بیٹھے۔اتنی رات گئے گاڑیاں کیوں دریا کے پار جارہی ہیں؟ اگر کچھ دغا نہیں ہے تو پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں۔شبہ کو استقلال نے تقویت دی۔ وردی پہنی۔طمنچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آپہنچے۔دیکھا

تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلفِ محبوب سے بھی زیادہ طولانی پُل سے اُتر رہی ہے۔ حاکمانہ انداز سے بولے ''کس کی گاڑیاں ہیں؟''

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ آدمیوں میں سے کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا۔

''پنڈت الوپی دین کی''۔

''کون الوپی دین''۔

''داتا گنج کے''۔

منشی بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا ممتاز زمیندار تھا۔ لاکھوں کی ہُنڈیاں چلتی تھیں، غلے کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحبِ اثر، بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے، بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا ''کہاں جائیں گی''؟ ''جواب ملا''۔ کانپور کو''۔ لیکن اس سوال پر کہ ''ان میں ہے کیا؟'' ایک خاموشی کا عالم طاری ہوگیا۔ اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کا ناکام انتظار کے بعد ذرا زور سے بولے ''کیا تم سب گونگے ہوگئے؟'' ''ہم پوچھتے ہیں ان میں کیا لدا ہوا ہے''؟

(۳)

جب اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا۔ یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ دفعتاً کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آکر جگایا اور بولے۔ مہاراج دروغا نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے

آپ کو بُلاتے ہیں''۔

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا۔ دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے اور ان کا قول بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے ''اچھا چلو۔ ہم آتے ہیں''۔ یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آ کر بے تکلّفانہ انداز سے بولے۔ بابو جی! آشیر باد۔ ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دیں گئیں۔ ہم برہمنوں پر آپ کی نظرِ عنایت ہی رہنی چاہئے''۔

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا۔ بے اعتنائی سے بولے ''سرکاری حکم''

الوپی دین نے ہنس کر کہا ''ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو۔ ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے۔ کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانت داری کا تازہ جوش تھا۔ کڑک کر بولے۔ ہم ان نمک حراموں میں سے نہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا۔ بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ ''جمعدار بدلو سنگھ تم انہیں حراست میں لے لو۔ میں حکم دیتا ہوں''۔

پنڈت الوپی دین اور ان کے ہواخواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتّفاق ہوا۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا لیکن

فرطِ رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہ پایا تھا۔ سکتے میں آ گئے، خیال کیا کہ یہ ابھی طفلِ مکتب ہے، دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا، الّھڑ ہے۔ جھجکتا ہے، زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے، بہت منکسرانہ انداز سے بولے ''بابو صاحب! ایسا ظلم نہ کیجئے۔ ہم مِٹ جائیں گے، عزت خاک میں مل جائے گی۔ آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ بہت ہوا تھوڑا بہت انعام اکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑا ہی ہیں''۔

بنسی دھر نے سخت لہجے میں کہا ''ہم ایسی باتیں سُننا نہیں چاہتے''۔

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹّان سمجھ رکھا تھا وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا۔ اعتمادِ نفس اور غرور دولت کو سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے ''لالہ جی! ایک ہزار روپیہ کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو۔ آپ اس وقت بھوکے شیر معلوم ہو رہے ہیں''۔

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا۔ ''ایک ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔'' دولت فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلائی اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کشمکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ حملے کئے، ایک سے پانچ ہزار تک، پانچ سے دس، دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلے میں یکہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا رہا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے ''اس سے زیادہ میری ہمت نہیں، آئندہ آپ کو اختیار ہے''۔ بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر تین قدم پیچھے ہٹ گئے اور نہایت منت آمیز بے کسی کے ساتھ بولے۔ ''بابو صاحب! ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں''۔

''غیر ممکن''۔۔۔۔۔۔

''تیس ہزار''۔۔۔۔۔۔

''غیر ممکن''۔۔۔۔۔۔ ''

کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں؟''

''چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ پر بھی غیر ممکن ۔ بدلو سنگھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتا''۔

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل نوجوان کو ہتھکڑیاں لئے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا، چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(۴)

دنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچہ سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آ رہی تھیں۔ گویا دُنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام پر بیچنے والا گوالا۔ فرضی روزنامچے بھرنے والے حکّام سرکار۔ ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے والے بابو صاحبان، جعلی دستاویزیں بنانے والے ساہوکار یہ سب اس وقت پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور کانسٹبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جُھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ دل میں غصّہ و غم تو سارے شہر میں ہل چل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوق نظّارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو۔ کثرتِ ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپیدا کنار کے نہنگ تھے۔ حکّام ان

کے قدر شناس ۔ عملے ان کے نیاز مند۔ وکیل اور مختاران کے ناز بردار اور اردلی کے چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام تھے۔ انہیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے، ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اس حملے کو روکنے کے لئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یکّہ وتنہا۔ سچائی کے سوا اور کچھ پاس نہیں۔ صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں لیکن ترغیبات سے ڈانوا ڈول۔ حتّٰی کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے کھنچا ہوا نظر آتا تھا، یہ ضرور سچ ہے کہ انصاف سیم وزر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا۔

لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ کا بہت جلد فیصلہ ہو گیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی ۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے، وہ ایک صاحبِ ثروت رئیس ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لئے ایسی حرکت کے مرتکب ہو سکتے ۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہیں لیکن صیغۂ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز وادراک کو مغلوب کر دیا۔ اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہئے ۔ وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اُچھل پڑے۔ پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ انہوں نے روپے برسائے۔ سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آ گیا اور اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت

سے نکلے تو، نگاہیں غرور سے لبریز، طعن و تمسخر کے آویزے چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کئے لیکن ایک اشارہ اس وقت اس نشۂ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا۔ شاید مقدمہ میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اسے پہلا سبق دے دیا تھا انصاف، علم اور پنچ حرفی خطابات، اور لمبی ڈاڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں۔

(۵)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجب تھی۔ مشکل سے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ معطّلی کا پروانہ آ پہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بیچارے دل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے سے بدظن ہو رہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی۔ ہم تو کلوار اور بوچڑ کے تقاضے سہیں۔ بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں۔ اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ، آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے۔ لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا اور آپ دیانت دار بننے چلے ہیں۔ ایسی سمجھ پر پڑھانا لکھانا سب اکارت کیا۔ اسی اثنا میں بنسی دھر خستہ حال مکان پہونچے اور بوڑھے منشی جی نے روداد سُنی تو سر پیٹ لیا اور بولے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں۔ بہت دیر تک پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے۔ غصّہ میں کچھ سخت سُست بھی کہا اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جائیں تو عجب تھا کہ غصّہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی امّاں کو صدمہ ہوا۔ جگن ناتھ اور رامیشور کی صدائیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے تو کئی دن تک سیدھے منہ بات نہ کی۔

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دل دوز ہمدردیاں سنتے سُنتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ

آ کر رُکا۔ سبز اور گلابی پردے، پچھائیں نسل کے بیل، ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے۔ سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دوڑے، دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جھک کر ڈنڈوت کیا اور مدبّرانہ کورفشانیاں شروع کیں۔ آپ کو کون سا منھ دکھاؤں منھ میں کالک لگی ہوئی ہے مگر کیا کریں۔ لڑکا نالائق ہے۔ ناخلف ہے ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے۔ ایشور بے چراغ رکھے۔ مگر ایسی اولاد نہ دے۔ بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا، مصافحہ کیا لیکن شان خودداری لئے ہوئے۔ فوراً گمان ہوا کہ یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندہ معذرت نہیں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت ناگوار گزرا۔ یکا یک پنڈت جی نے قطع کلام کیا ''نہیں بھائی صاحب ایسا نہ فرمایئے''

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے جواب دے دیا۔ انداز حیرت سے بولے ''ایسی اولاد کو کیا کروں''۔ الوپی دین نے کسی قدر خوشی سے کہا ''فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا۔ ایسا سپوت لڑکا پا کر آپ کو پرماتما کا شکرگزار ہونا چاہئے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی اسے زمانہ سازی نہ سمجھئے۔ زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس رات کو مجھے آپ نے حکومت کے زور سے حراست میں لیا تھا۔ آج خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ مین نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے۔ ہزاروں عالی مرتبہ حکّام سے سابقہ پڑا لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے، میں نے سب کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑا۔ اجازت دیجئے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟

بنسی دھر کو ان باتوں میں کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اڑتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی ایک گہری جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے۔ یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ فرض نے مجھے آپ کی شان میں بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کی خاک پا ہوں۔ جو آپ کا ارشاد ہوگا بحدِ امکان اس کی تعمیل سے انکار نہ کروں گا۔

الوپی دین نے التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا لیکن آج میری درخواست قبول کرنی پڑے گی''۔

بنسی دھر نے جواب دیا ''میں کس قابل ہوں، لیکن مجھ ناچیز سے جو کچھ خدمت ہو سکے گی اس میں دریغ نہ کروں گا''۔

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے ''اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمایئے اور اس پر دستخط کیجئے، میں برہمن ہوں جب تک یہ سوال پورا نہ کیجئے گا دروازے سے نہ ہٹوں گا''۔

منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انہیں اپنی ساری ملکیت کا مختار عام قرار دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لئے۔ روزانہ خرچ الگ۔ سواری کے لئے گھوڑے، اختیارات غیر محدود۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولے ''میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے ان عنایات بے کراں کے قابل سمجھا لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں''۔

الوپی دین ہنس کر بولے ''اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجئے''۔

بنسی دھر نے متین انداز سے کہا ''یوں میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ جیسے نوارنی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست، نہ وہ تجربہ ہے جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لئے بڑے معاملہ فہم اور کارکردہ منشی کی ضرورت ہے''۔

الوپی دین نے قلم دان سے قلم نکالا اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے۔ ''مجھے نہ علم کی ضرورت نہ فراست کی، نہ کارکردگی، نہ معاملہ فہمی کی، ان سنگریزوں کے جوہر میں بارہا پرکھ چکا ہوں، اب حسنِ تقدیر اور حسنِ اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے، جس کی آب کے سامنے علم اور فراست کی

چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے، زیادہ تامل نہ کیجئے، اس پر آہستہ سے دستخط کیجئے، میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ سدا وہی ندی کنارے والا بے مروّت، سخت زبان، تند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے''۔

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظرف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے دستخط کر دئے۔ الوپی دین فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے اور اُنہیں گلے لگا لیا۔

مشکل الفاظ کے معنی

الفاظ	معنی
روزن وشگاف	سوراخ
بالائی رقم	اوپری رقم
سرگوشیاں	کان میں بات کہنا
جسارت	دلیری
نہنگ	مگرمچھ
شہادت	گواہی
تحریص	لالچ دلانا
قیافہ	صورت دیکھ کر اچھے بُرے جاننے کا علم
طفل مکتب	طالب علم
قلزم ناپیدا کنار	گہرا سمندر
استغاثہ	دعویٰ
منفعت	فائدہ
مرّبی	پرورش کرنے والا
بےاعتنائی	فکر نہ کرنا، مہربانی نہ کرنا

سقف	چھت
محال	انہونی
ترش روئی	بدخلقی
برقنداز	پاسبان، بندوقچی
مشاہرہ	تنخواہ
مواخذہ	جواب طلبی
انگشت بدنداں	دانتوں تلے انگلی دبانا
سیم وزر	چاندی سونا

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات

۱۔ منشی پریم چند کا اصلی نام کیا تھا؟

۲۔ انگریزی حکومت نے بغیر سرکاری حکم کے کس چیز کی تجارت پر روک لگا دی تھی؟

۳۔ کونسی ندی کے کنارے الوپی دین کی گاڑیاں پکڑی گئیں؟

مختصر سوالات

۴۔ بنسی دھر کے والد نے انہیں کیا نصیحت کی تھی؟

۵۔ پنڈت الوپی دین کے کردار پر اظہارِ خیال کیجیے۔

۶۔ منشی بنسی دھر کو مقدمہ ہارنے کے بعد کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

تفصیلی سوالات

۷۔ منشی بنسی دھر کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

۸۔ افسانہ 'نمک کا داروغہ' کا خلاصہ لکھیے۔

علی عبّاس حسینی

علی عبّاس حسینی ۱۸۹۷ء میں ضلع غازی پور کے ایک قصبے بارہ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ، پٹنہ میں حاصل کی اورالہ آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔اے۔کرنے کے بعد ایل۔ٹی ۔کی سند حاصل کی۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمۂ تعلیم میں مدرس ہو گیے اور پھر پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔آپ نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی اور یہیں ۱۹۶۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

پریم چند کی طرح ان کے افسانوں کا خاص موضوع دیہات کی زندگی ہے۔خاص طور سے متوسط طبقہ کی زندگی کو پیش کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی ہیں چنانچہ افسانوں میں وہ اکثر میل جول اور اتحاد کی تلقین کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔وہ فارسی اور عربی کے مشکل اور نامانوس الفاظ کی بجائے ہندی کے خوبصورت اور سادے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔حسینی صاحب کو انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے۔اسی لیے ان کے کردار ہماری طرح حساس اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔علی عبّاس کے افسانوں کے پلاٹ نہایت دلکش اور فطری معلوم ہوتے ہیں اوران میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔اِصلاحِ معاشرہ کا کوئی پہلو ایک ہلکے رنگ کی طرح پورے افسانے پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔''آئی۔سی۔ایس''،''باسی پھول''،''میلہ گھومنی''اور''کچھ ہنسی نہیں ہے''ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔''اردو ناول کی تاریخ وتنقید''حسینی صاحب کی تنقید کی کتاب ہے۔

آئی۔سی۔ایس حسینی صاحب کا نہایت مقبول اور پسندیدہ افسانہ ہے۔اس کا مرکزی کردار وحید

ہے۔اس کی ابتدائی تعلیم وتربیت دیہات میں ہونے کے باوجود وہ اپنی ذہانت اورمحنت کی بنا پر ہر درجہ میں اوّل آتا ہے اور آئی۔سی۔ایس۔کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا جاتا ہے۔انگلینڈ میں وہ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کیے بغیر جہاں آرا بیگم سے شادی کر لیتا ہے۔شادی کے بعد وحید ہندوستان آجاتا ہے اوراپنے گھر والوں کی غریبی اور جہالت کے باعث اپنی بیگم کو اپنے گاؤں نہیں لے جاتا۔لیکن بعد میں اپنی بیگم کے اصرار پر گاؤں جاتا ہے اور وہاں کے دیہاتی ماحول اور گھریلو فضا میں آئی۔سی۔ایس۔کا چوغہ اتار دیتا ہے۔اسی طرح وحید کے گھر والوں کی سادگی اور بے لوث محبت سے متاثر ہوتی ہے۔اس افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ہمیں اپنے تہذیب وتمدن کو نہیں بھولنا چاہیے۔

علی عبّاس حسینی

آئی۔سی۔ایس

وحید کا آئی۔سی۔ایس میں لیا جانا بالکل داتا کی دین تھی۔ایک غریب دیہاتی کا شتکار کا لڑکا جو گیارہ، بارہ برس کے سِن تک ایک چھوٹے مختصر اور تنگ کچے مکان میں پلا ہو، جو گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ گُلی ڈنڈا، گنڈی، گیڑی اور آنکھ مچولی کھیلنے میں لگا رہا ہو، جس نے ہر بڑے سے بڑے درخت پر چڑھ جانے اور چھپ بیٹھنے میں مہارت حاصل کی ہو، جس نے سات برس کی عمر سے گائیں بھینسیں خود دوہی ہوں اور ان کا گوبر اپنے ہاتھ سے اُٹھایا ہو وہ اگر آج آئی۔سی۔ایس پاس ہو اور ہیٹ کوٹ پہنے، صاحب بنا ''ول ٹم کیا مانگٹا، اور ہم نہیں جانٹا'' بولنے کا فخر حاصل کرلے۔ واقعی بخشش الٰہی تھی۔ یا حضرت موسیٰ کے لئے سُنا تھا۔ یہ وحید کے معاملے میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

ہم نے مانا کہ بارہ برس کے سِن سے اس کندۂ ناتراش کو ایک دُور کے عزیز نے رحم کھا کر اپنے پاس رکھا، خراد پر چڑھایا اور آدمی بنایا، مگر یہ سب رحمتِ باری، فضلِ الٰہی تھا، اس نے اگر ان عزیز کے دل میں اولاد کی خواہش کے ساتھ ساتھ ان کی گود بھی اولاد سے بھر دی ہوتی، تو پھر کیا ہوتا؟ اگر وحید کی فطرت میں اثر قبول کرنے کا مادّہ نہ ہوتا، اچھے خاصے جانور سے بھلا مانس انسان بننے کی صلاحیت ودیعت نہ کی ہوتی تو وہ کیوں اسکول یا کالج ہی سے اپنے کپڑوں، اپنے فیشن، اپنی تہذیب، اپنے سلیقے اور اپنی ذہانت کے لئے مشہور ہوتا؟ پودے ایک زمین سے نکال کر دوسری زمین میں لگا دینے سے اپنی نوعیت وجنس نہیں بدل دیتے، نیم آم نہیں بن جاتا، نہ گیندا گلاب بن جاتا ہے۔

مگر یہاں وحید کے معاملے میں تو محمد پور کیا چھوٹا اور الہ آباد کیا ملا کہ ایسا معلوم ہوا شخصیت ہی دوسری ہوگئی۔ جون بدل گئی، جس طرح اس نے محمد پور کے پھٹے پُرانے کپڑے اُتارے اور الہ باد کے

نئے چمکتے بھڑکتے کپڑے پہن لئے ،اسی طرح اس کی وہ بارہ برس تک کی طبیعت ،ضد، جھلاہٹ ،شرارت ،بھدّا پن، ہٹیلا پن، الھڑ پن گنوار پن، بدتہذیبی، بداخلاقی ،کج روی، یاوہ گوئی، دریدہ ذہنی، بیہودہ گوئی ،کم عقلی، بداطواری، دیرفہمی، بدشوقی اور موقع ناشناسی سب محمد پوری کپڑوں کے ساتھ اتر گئی اور اس کی جگہ آلہ آبادی کپڑے پہنتے ہی متانت ،سنجیدگی ،خودداری، وقار، زودفہمی، سگھڑاپا، تہذیب، اخلاق، شرافت، نیکی، ذکاوت، ذہانت، جامہ زیبی، خوش مزاجی، معاملہ فہمی، سخن سنجی آ گئی۔ ہمارا یہ ادّعا نہیں کہ یہ فرق فوراً ہی پیدا ہو گیا تھا، واقعی ایک جگہ سے چھوٹتے، ایک گھر سے نکلتے اور دوسرے گھر میں داخل ہوتے ہی پیدا ہو گیا تھا۔نہیں اس تبدیلی میں سال دو سال ضرور لگے تھے۔مگر پھر بھی یہ ایسا سریع اور عظیم انقلاب تھا جسے کایا پلٹ ہو جانا کہتے ہیں۔

بہرنوع مالک کی دین کہئے یا وحید کی فطری صلاحیت وقابلیت۔ ہوا ایسا ہی کہ وحید جس دن سے اسکول میں داخل ہوا اور جس دن تک وہ تعلیم پاتا رہا، ہمیشہ اپنے درجہ میں اول آیا، یہاں تک کہ ایم۔اے پاس کرنے کے بعد آئی۔سی۔ایس بھی ایسے اچھے نمبروں سے پاس ہوا کہ نہ سعئ سفارش کی ضرورت ہوئی اور نہ خاندانی حقوق وخدمات گنانے پڑے اور وہ دس برس انگلستان میں مزید تعلیم وتجربہ حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ وہاں کے قیام کے بعد ریاست مہید پور کے ایک رکن خاص صاحبزادہ شہاب الدین خاں سے ملاقات وراہ ورسم پیدا ہوئی اور اسی سلسلے مین ان کی صاحبزادی جہاں آرا بیگم سے بھی جو اس سال آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ میں نمایاں حیثیت سے کامیاب ہوئی تھیں۔روزانہ ملنے جُلنے نے کشش پیدا کی۔صاحبزادہ کی اجازت اور جہاں آرا بیگم کی پسندیدگی سے اُس نے وہیں بیاہ رچایا اور نئی دُلہن ساتھ لے کر ہندوستان پلٹا، چونکہ دل میں یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں افلاس اور دیہاتیت کا پول نہ کھل جائے، اس لئے ہندوستان میں پہنچنے اور دہلی حضور وائسرائے کے صدر دفتر میں تعناتی کا درمیانی زمانہ ریاست مہید پور میں سسرال ہی میں بسر کیا۔ اور گھر لکھ کر بھیجا کہ ''میں فی الحال مکان نہیں آ سکتا۔لیکن

برابر والد کے لئے خرچ بھیجتا رہوں گا۔ کسی کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بوڑھا باپ دل مسوس کر، بوڑھی ماں رو دھو کر، اور بھائی خفا ہو کر خاموش رہے، وہ جانتے تھے کہ ان کا گھر اس قابل نہیں کہ کوئی آئی۔سی۔ایس آ کر قیام کرے، وہ اسے خوف سمجھتے تھے کہ ان کا جھونپڑا کسی بیگم بہو کے اُتارنے کے لائق نہیں، انہوں نے ٹھنڈی سانسیں بھریں، آسمان کو دیکھا اور چھاتی پر سِل رکھ لی۔

غرض بیگم وحید نے نہ اپنی سسرال دیکھی، اور نہ ساس سُسر، نہ جیٹھ دیوروں سے ملنے کی نوبت آئی، وحید دہلی میں لاٹ صاحب کے دفتر میں کام کرنے لگا۔ وہاں کے مشاغل، بڑے بڑے آدمیوں سے ملنا جُلنا، راجگان، مہاراجگان، والیانِ ملک کی پارٹیاں، ایٹ ہوم، ڈنر، سنیما تھیٹر، کھیل، تماشے، غرض سماجی زندگی میں کسی طرح کی کمی نہ تھی اور نہ ان کی وجہ سے اتنی فرصت تھی کہ نئے رشتہ داروں اور نئے عزیزوں کی زیادہ فکر کی جائے۔ مگر بیگم کے لئے یہ دلچسپیاں ہو سکتی تھیں، وحید کی ماں کے لئے تو نہیں، اس نے تو وحید کو جنا تھا۔ اس کی مامتا کو بھلا کیسے چین پڑتا۔ وہ بیٹے کو خط لکھتی رہی ''بس ایک نظر دکھا جانے کی خواہش تھی، بہو کے دیکھنے کی بھی بڑی تمنّائیں تھیں، بیٹے کی شادی کے بارے میں بڑھیا نے نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا، اپنوں پرایوں میں بہت سی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں، مگر وہاں صاحبزادے خود ہی بیگم بیاہ لائے، شادی ایسے چُپ چپاتے کر لی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور معلوم بھی ہوتا تو پہنچتی کیسے؟ کالے کوسوں دُور، سمندر پار، انگلستان میں، پھر سسرال اپنے موڑ کی نہ جوڑ کی، وہاں روپیوں کی، عزت کی، شان وشوکت کی افراط تھی۔ یہاں افلاس وتنگ دستی، نکبت کی بہتات، بہو پڑھی لکھی، آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ، لاٹ صاحب سے ہاتھ ملانے والی، ساس جاہل، دیہاتن اور پردے میں بیٹھنے والی، اس سے ساس کی طرح پیش آنا، بہو بنا کر ملنا ہاتھی سے گنّا کھانا تھا، مور کی طرح ناچنے کو جی تو ضرور چاہتا تھا لیکن پاؤں کو دیکھ کر لاج بھی آتی تھی، صبر کی سِل چھاتی پر رکھی، مگر یہ بوجھ اتنا بھاری تھا کہ پہلو میں درد ہونے

لگا۔اس بے چینی نے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ پہلے تو لڑکے ہی کو لکھتی رہی، جب ادھر سے برابر ٹالنے ہی والا جواب ملا۔تو پھر ایک دن انہوں نے چھوٹے لڑکے حمید کو پاس بُلایا اور دل کی ساری کہانی بیگم بہو کو لکھوادی۔

بات چونکہ دل سے نکلی تھی اس لئے دل میں گھر کر گئی، بیگم بہو کو لفظ لفظ میں خلوص، سادگی اور سچائی کی عطر آگیں بوئے خوش آئی، وہ ہاتھ میں خط لئے بیساختہ آئی۔سی۔ایس وحید کے دفتر میں گھُس آئیں اور اس کے سامنے فائلیں کھینچ کر بولیں:

''کیوں صاحب؟ یہ آخر آج تک آپ نے مجھے میری سُسرال کے لوگوں سے کیوں نہ ملایا؟''

مسٹر وحید آئی۔سی۔ایس بیگم کے اس طرح چیں بجبیں آنے سے یوں ہی گھبراتے تھے، اس غیر متوقع سوال نے انہیں کچھ ڈرا سا دیا۔وہ ذرا اٹک اٹک کر بولے:

''جب سے ہندوستان پلٹ کے آیا، تمہارے میکے گیا، پھر وہاں سے ملازمت پر چلا آنا پڑا، یہاں کے کاموں میں کچھ اس طرح پھنس گیا کہ.....''

وہ بات کاٹ کر بولیں۔''ماں باپ اور بھائیوں سے بھی نہ مل سکے اور نہ بیوی کو ملا سکے؟''وحید کی ذہانت کام آئی۔اس نے ذرا مسکرا کر کہا''یہ آج دفعتہً آپ کو سسرال کیوں یاد آگئی۔کیا کسی نے خط لکھا ہے؟''

بیگم بولیں''جی ہاں''۔میں انسان ہوں ہی نہیں کہ مجھے فکر ہوتی! بارہا آپ سے پوچھا، آپ نے کہا کسی دن اطمینان سے باتیں ہوں گی، تو بتاؤں گا، شاید آپ مجھے انسان نہیں سمجھتے یا اپنے گھر والوں کو جانور سمجھتے ہیں!''۔

وحید نے ذرا متانت سے کہا۔''بھئی ہے تو یوں ہی کہ تم ان لوگوں سے مل کر کچھ خوش نہ ہوگی، نہ وہ کچھ باتیں کرنا جانیں، نہ آداب وتہذیب سے واقف، نہ اُن کے رہنے سہنے کا طریقہ ہم لوگوں کا سا''!

بیگم نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔ ''اب آپ زیادہ ان کی تعریفیں بیان کرنے کی زحمت نہ کیجئے۔ آج آپ کی والدہ کا خط آیا ہے، میں خود ہی چل رہی ہوں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گی''!

وحید گھبرا گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''ارے تم وہاں چلو گی؟ محمد پور؟''

اس نے کہا ''ہاں ہاں، کیا کوئی وہاں کٹکھنا کتّا چھوڑا ہوا ہے کہ جاتے ہی مجھے کاٹ کھائے گا؟'' اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وحید دیر تک سناٹے میں رہا، جانتا تھا کہ گھر میں رہنے کی جگہ مشکل سے نکل سکے گی، بیگم مُصِر تھیں کہ میں ضرور جاؤں گی، کہاں قیام ہوگا، کیا انتظام؟ پھر جتنی ادھر تعلیم وشائستگی، تہذیب و مدنیت تھی، اتنی ہی ادھر جہالت، غیر شائستگی اور دیہاتیت! خدا جانے بڑی بی نے کیا لکھوا دیا ہے کہ بیگم پر اس قدر اثر ہوا، آج تو پوری تریاہٹ کا مزا آ گیا، اس نے جلدی سے خطوں کا کاغذ کھینچا، باپ کو خط لکھا۔ اسی وقت بنک گھر گیا، وہاں سے تین سو روپیوں کے نوٹ لئے۔ ڈاک خانہ سے رجسٹری لفافہ منگا کے بیمہ کر دیا۔ خط میں لکھا:۔

''فوراً خانۂ باغ کے احاطے میں گمّوں کے کھمبے جڑوا کے ان پر بنگلے نما پھوس کا چھپّر ڈلوا دیجئے۔ اور معمولی ٹڑّیوں کی دیواریں کھینچ کر اس کے اندرونی حصّوں میں کئی کمرے بنوا دیجئے۔ بیگم آپ لوگوں سے ملنے آ رہی ہیں۔ بس کوئی پندرہ دن میں ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ صحیح تاریخ سے بعد میں اطلاع دوں گا''۔

جب بیمہ لگا چکا تو وحید نے اطمیان کی سانس لی۔ اب بہت کچھ ذمہ داری اس کے سر سے ہٹ گئی۔ اب بس اتنی سی بات اور رہ گئی تھی کہ بیگم کو چھٹی نہ ملنے کا بہانہ کر کے پندرہ دن اور روکنا تھا۔

اس امر میں زیادہ دقّت بھی نہ ہوئی اس لئے بیگم نے سسرال چلنے کا قطعی فیصلہ سُناتے ہی وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ متواتر کئی راتوں اور کئی دن وحید کو اپنے بڑے بھائیوں اور ان کی

بیویوں کے نام، اور حُلیہ، ان کے بچوں کی تعداد، بہنوں اور ان کے شوہروں کے نام، ان کی صورت شکل، بن بیاہے بھائی کی عمر، لیاقت، مزاج، طبیعت، قد وقامت، بڑے میاں اور بڑی بی کی پسند کی چیزیں سب بتانا پڑیں۔ بیگم بات اور بات کی جڑ، سب کچھ کھود کھود کر پوچھتی تھیں۔ بعض وقت تو مسٹر وحید ان کے سوالات کا جواب دیتے دیتے عاجز آجاتے تھے۔ لیکن اسی ساتھ بیگم کی اس غیر معمولی دلچسپی لینے کا نفسیاتی اثر ان پر بھی شروع ہوا۔ سپید رنگ کا خون بدلنے لگا۔ فطرت میں جو اپنوں سے، اپنے ماں باپ بھائی بہن سے ہمدردی ومحبت تھی، اور جو آئی۔سی۔ایس کی مخملی پردوں سے ڈھک دی گئی تھی، جس پر انگلستان اور ہندوستانی سکریٹریٹ کے ماحول نے ایک نیا ملمّع چڑھا دیا تھا۔ بیگم کی کرید نے اس مخمل کو گھس ڈالا، بار بار کے سوال وجواب سے ملمّع اُتر گیا۔ خلوص ویگانگت جگہ جگہ سے جھلکنے لگی۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا جس کا بیگم کو بے چینی سے انتظار تھا۔ یعنی وحید کی پندرہ دن کی چھٹی منظور ہوگئی اور سفر کے لئے اسباب بندھنے لگا۔ بیگم نے نہ جانے کیا سمجھا تھا کہ دس بارہ ٹرنک اور سوٹ کیس کپڑوں سے بھر لئے تھے۔ وحید نے چلنے سے کچھ گھنٹے قبل اتفاق سے یہ سامان دیکھ لیا تھا۔ بڑی ردّوکد کی مگر بکسوں میں کمی نہ ہوئی اور سب کے سب موٹر کے علاوہ کرایہ کی لاری پر لاد کر اسٹیشن پہنچائے گئے۔

گاڑی چلی تو وحید کا پس وپیش پھر بڑھا۔ سوچ یہ تھا کہ خدا جانے گھر پر والدین نے بیگم کے لائق کوئی جگہ حسب ہدایت بنوائی بھی یا نہیں، بیگم کو ان دیہاتیوں کی باتیں پسند آئیں یا نہ آئیں۔ خود ان لوگوں کو بیگم کی بے پردگی بھائے یا نہ بھائے، وہ سب کے سب پُرانے خیال کے، دقیانوسی مراسم کے پابند، ادھر رئیسوں، امیروں کا طور طریقہ، انگلستان ویورپ کی تعلیم وتربیت، دیکھئے جوڑ کیسے بیٹھتا ہے، اور آپس میں کیسی نبھتی ہے، آگ وبرف کا تال میل بیٹھے نہ بیٹھے! یہ جدھر بھی نظر کرتا، جس پہلو پر غور کرتا۔ دشواریاں دکھائی دیتیں۔ جی چاہتا بیگم کو سمجھائیں۔ ان کو اس سفر کے نشیب وفراز سمجھائیں۔

مگر بیگم کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے ابتدائے سفر سے ایک ناول جو شروع کیا تو راستے بھر اسی کو پڑھتی رہیں، سفر طویل تھا، ایک دن اور ایک رات گاڑی ہی پر دونوں رہے مگر سوائے کھانا کھانے کے اوقات کے کسی وقت باتیں کرنے کا موقع نہ ملا۔ ایک تو فرسٹ کلاس میں ہونے کی وجہ سے دونوں کے برتھ کافی فاصلے پر تھے، دوسرے ان کے برتھ والے حصّے پر ایک انگریز دراز تھا۔ ایسی حالت میں نجی اور خانگی گفتگو ناممکن ہی نہیں بلکہ محال تھی، کھانے کے میز پر رسڑاں کار میں اس کا موقع نہ تھا، پاس ہی پاس مختلف میزوں پر دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے، کس طرح یہ مسئلہ چھڑ سکتا تھا؟ غرض محمد پور اسٹیشن آ گیا اور یہ بیگم صاحب سے کچھ نہ کہہ سکے۔

وہاں اسٹیشن پر جو گاڑی رُکی تو چھوٹا بھائی مع پنس اور آٹھ کہاروں کے دکھائی دیا۔ وحید نے بیگم سے جلدی سے کہا ''یہاں شاید تمہیں پردہ کرنا پڑے''۔

انہوں نے کہا ''میں پہلے ہی سے اس کے لئے تیار ہوں'' اور کہتے ہی بکس کھول کر برقعہ نکال کر پہن لیا۔ وحید کو اس کی خبر بھی نہ تھی کہ وہ اتنا انتظام کئے بیٹھی ہیں۔ اس لئے اسے بہت ہی تعجب ہوا مگر چھوٹے بھائی کی گھبرائی ہوئی خوش صورت اور اسٹیشن پر زیادہ دیر گاڑی نہ رُکنے کے خیال نے گفتگو کا موقع نہ دیا۔ اور ڈبے کے سامنے پنس لگتے ہی بیگم اس میں جلدی سے سوار کروائی گئیں اور وحید مع اپنے بھائی کے بیل گاڑی پر اسباب لدوانے کے احکام صادر کر کے تانگے پر بیٹھ کر روانہ ہوا۔

حمید، اس کا بھائی اس سے پانچ برس چھوٹا تھا۔ اس نے قصبہ کے ورنا کیولر اسکول سے اردو مڈل پاس کر کے تعلیم چھوڑ دی تھی اور کاشتکاری میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اس لئے اس میں نہ تو وہ ''کلچر'' تھا جو ایک تعلیم یافتہ شخص میں پایا جاتا ہے اور نہ اس میں وہ تہذیب و شائستگی تھی جو شہروں میں رہنے اور اچھی سوسائٹی میں ملنے جُلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک ناتراشیدہ اور ناصاف کردہ ہیرا تھا۔ جس پر اب تک میل چڑھا ہوا تھا۔ مگر اس دیہاتیت اور بھدّے پن میں خلوص کی آب و تاب ماند نہ ہوئی تھی۔ وہ تانگا خود

ہی ہانکتا جاتا تھا اور بھائی سے بہت ہی بے تکلفی سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ اور موقع موقع سے بھائی کے آئی سی. ایس، شہری اور رئیس ہونے پر طعن بھی کرتا جاتا تھا۔ غرض اس کی باتوں نے، بچپن کے مانوس مناظر نے، وطن کے سرسبز درختوں نے اور قصبے کے ہرے ہرے کھیتوں نے وحید پر آہستہ آہستہ اثر کرنا شروع کیا۔ وہ سب سے پہلے تو یہ بھولا کہ وہ آئی سی. ایس ہے، پھر یہ بھولا کہ وہ بیگم سی تعلیم یافتہ رئیسہ کا شوہر ہے، پھر یہ بھولا کہ اس سے ہندوستان کے بڑے بڑے راجگان مہاراجگان سے ملاقات ہے، پھر وہ یہ بھی بھولا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ مہذب انسان ہے، وہ کیا کرتا؟ جن حصّوں سے وہ گزر رہا تھا، ان کا ایک ایک ذرّہ، ایک ایک چپہّ، ایک ایک بوٹا اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہی زمین جس پر وہ کبھی ننگے پاؤں دوڑا تھا، وہی کھیت جن میں اس نے اپنے ہاتھ سے مٹر اور چنا بویا تھا، وہی درخت جن کی شاخوں پر جلد سے جلد چڑھ جانے کے مقابلے میں وہ جیتا تھا، وہی چڑیاں جن کے بچے پکڑ لانے کے لئے وہ قصبہ بھر میں مشہور تھا، یہ ساری چیزیں اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں اور اپنے اپنے طور پر دل کی گہرائیوں میں اپنے اپنے گرے پڑے گھروں کو کرید کرید کر اپنے بیٹھنے کی جگہیں بنا رہی تھیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، سرسبز درخت لہلہا رہے تھے، ہرے ہرے کھیت آنکھوں کو تراوٹ پہنچا رہے تھے اور سوندھی سوندھی مٹی کی بو، مشام جان کو معطّر کئے دیتی تھی کہ اتنے میں مکان کی کچی دیوار دکھائی دی۔ معلوم ہوا جیسے روح کی گردن میں پھندا ڈال کر کسی نے کھینچنا شروع کیا۔ چھوٹے بھائی نے بھی گھوڑے کو ایک چابک رسید کی۔ وہ پہلے ہی گھر دیکھتے ہنہنا کے قدم بڑھا چکا تھا۔ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ وحید کا دم اس طرح پھول رہا تھا جیسے گھوڑے کی جگہ وہ خود اس دوڑ میں شریک ہو، عجب نہیں کہ اس کی نظر کے تار پر اس کی روح دوڑ رہی ہو!

بارے گھر آیا۔ سامنے ہی بڑے میاں دکھائی دیئے۔ گھر پر سوائے کُرتے، پائجامے اور سلیپر کے کچھ نہ پہنتے تھے۔ مگر آج خلاف معمول شیروانی بھی پہنے تھے اور غالبًا آئی سی. ایس بیٹے اور تعلیم یافتہ بیگم

بہو کی خاطر یہ زحمت گوارا کی تھی۔ وحید نے تانگے سے اُتر کر جھک کے تسلیم کی۔ اُنہوں نے آبدیدہ ہو کر گلے سے لگا لیا۔ باہری مکان میں قصبہ کے اور بھی عمائد موجود تھے جنہوں نے بچپن میں اس کی گوشمالی کی تھی اور ایسے بھی جو اس کے ساتھ بہت سی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ سب بڑی محبت سے ملے۔ بڑے میاں نے کہا ''گھر میں اس وقت جانے کا موقع نہیں ہے، وہاں دُلہن اتارنے کے لئے ساری برادری کی عورتیں جمع ہیں، آؤ تمہیں نئے مکان میں پہنچا دیں، اسے دیکھ لو اور نہا دھو کر کپڑے بدل ڈالو۔ پھر باتیں ہوں''۔ یہ کہہ کر خانہ باغ میں لے گئے، وہاں وحید کے حسب خواہش پختہ کھمبوں پر ایک بنگلہ نما چھپّر ڈال دیا گیا تھا۔ بیچ میں سبز کپڑے تان تان کے مختلف دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ یعنی اچھا خاصا صاحب کے لئے ڈرائنگ روم، ڈریسنگ روم، سلیپنگ روم، ڈائننگ روم اور کچھ مخصوص کمرے بیگم صاحبہ کے لئے تیار تھے۔ پلنگ، کرسیاں، فرش سب چیزیں سلیقے سے لگی تھیں۔

وحید حیرت سے اپنے والد کا منہ دیکھ کر بولا ''یہ سب سامان کس نے اتنے سلیقے سے لگا ڈالا؟ انہوں نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

''جس دن سے تمہارا خط آیا ہے، بس یہ انہیں کاموں میں لگا رہا، پھر گاؤں بھر کے تمام جوان ساتھ تھے، انہی سبھوں نے مل کر یہ سب درست کیا ہے، نہ دن کو دن سمجھا ہے نہ رات کو رات!،،

وحید نے بھائی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ وہ بولا ''ہم دیہاتیوں کے ہاں صاحب، مع میم صاحب کے تشریف لا رہے تھے، پھر ہم اتنا بھی نہ کرتے! آئی سی .ایس میں جو لوگ ہوتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں نازک، ان کے دل و دماغ نازک ہوتے ہیں۔ اب اگر آپ ہمارے موٹے بھدّے اور بدشکل پلنگ استعمال کرتے تو آپ کو تکلیف نہ ہوتی؟''

وحید نے مسکرا کر کہا ''ہوں'' تو تم سمجھتے ہو کہ ہم لوگ بالکل ہی نازک ہوتے ہیں، کیوں''؟

وہ بولا اور کیا؟ کیا آپ میرے ساتھ کھیت گوڑ سکتے ہیں؟ پُر چلا سکتے ہیں؟ پانچ منٹ میں بھاگ

نکلئے گا؟''

وحید نے کہا ''اچھا ذرا میں نہالوں تو تم کو بتاتا ہوں''۔

اس نے کہا ''بہت اچھا، آج ہی شام کو بھابھی کے سامنے''!

بیگم کا اندر کیا ریسپشن ہوا، کس کس طرح کی رسمیں کی گئیں، بیبیوں نے کیا کیا فقرے کسے؟ کس کو پسند آئیں کس کو ناپسند آئیں، خود ان پر کیا گذری اور ان کے ساتھ کی ماما دائیوں نے کیا رائے قائم کی، یہ سب تمام باتیں بیان کرنا اس مختصر فسانے میں ممکن نہیں، اس کے لئے ایک پورے ناول کی ضرورت ہے، ہاں اتنا ظاہر میں آنکھیں بھی دیکھ سکتی تھیں کہ تمام وہ احکام جو ساس نے نافذ کئے وہ خوشی خوشی بجالائیں۔ یہاں تک کہ بڑی بی نے اپنی دیہاتی لب و لہجے میں خود کہا کہ ''اللہ تمہیں مانگ کوکھ سے ٹھنڈا رکھے۔ تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ مجھے بڑے بڑے وسواس تھے۔ مگر مجھے ایسا جان پڑتا ہے کہ میں دن میں چراغ لے کر ڈھونڈتی تو ایسی بہو نہ مل سکتی۔ نندوں نے اس پر خوب خوب فقرے کسے، مگر بڑی نند نے چھوٹیوں کو ڈانٹا، اور انہیں اپنے ساتھ لے کر خانہ باغ والے مکان میں پہنچا آئیں۔

شام کو جب اعزّا اور برادری کے لوگ جا چکے تو سارا گھر نئی بہو کے پاس سمٹ کر آ گیا، بڑے میاں رونمائی کے لئے بلائے گئے اور بیوی کو ایک بھدیسل سونے کا زیور دے کر بہو کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ بڑی بی نے کہا۔ ''وحید کو بھی بلالو'' اب سب رسمیں ہو گئیں، اب خواہ مخواہ کی شرم بے کار ہے۔'' وحمید بھی آئے، بیگم نے اپنی بوڑھی ماما کی طرف دیکھا۔ اس نے خوان پر خوان لانا شروع کئے۔ کسی میں بڑی دیا دن کے لئے جوڑا نکلا، تو کسی میں نندوں کے لئے! تہذیب یہ کہ جس کا جوڑا ہوتا اس کے سامنے خوان لے کر بیگم خود جاتیں اور خوان رکھ کر اس طرح مودّب کھڑی رہتیں جیسے معلوم ہوتا کوئی پجارن کسی دیوی کے سامنے بھینٹ چڑھا رہی ہے۔

میاں حمید پہلو بدل رہے تھے کہ عورتوں کو سب کچھ ملا، مجھ غریب کو کچھ بھی نہیں کہ اتنے میں ایک

خوان آیا، بیگم وہ لے کر اس کی طرف بڑھیں۔ اس نے جلدی سے بڑھ کر خوان سنبھال کر رکھا، خود خوان پوش ہٹا کر دیکھا، خوان مین کئی شیروانیوں اور قمیصوں کے کپڑے اور کئی پائجامے سلے ہوئے رکھے تھے۔ ان کے ساتھ مختلف قسم کے رومال، موزے، عطر، سینٹ، کنگھا، تیل اور ایک آئینہ اور کچھ روپئے بھی رکھے تھے، حمید شرما گیا، بیگم نے آہستہ سے کہا۔ ''بھیّا پاؤں اور سر کی ناپ نہ معلوم تھی اس لئے ٹوپی اور جوتہ نہ خرید سکی۔ آپ اپنی پسند کا خرید لیجئے۔

وہ ان چیزوں کو لیتے ہوئے جھجھکا تو بڑے میاں نے کہا۔ ''اخّاہ آج آپ بھی شرما رہے ہیں۔ ارے بیوقوف تو تو چھوٹا ہے، بندگی کر اور سب جلدی سے سمیٹ!'' اس نے جلدی سے بیگم کو تسلیم کی، روپیہ اُٹھانا چاہا، ماں نے کہا اور بھائی کو تسلیم نہیں کی؟''

وحید نے کہا ''جی روپئے تو بیگم نے دئے ہیں اور کپڑے بھی انہیں نے، میرا خدا شاہد ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ انہوں نے یہ سب سامان کب اور کیونکر درست کیا''؟

سب نے بیگم کو بڑی محبت سے دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر سر جھکایا۔ سب سے آخر میں دو بڑے بڑے خوان آئے، بیگم نے ایک ساس کے سامنے رکھا، ایک سُسر کے، دونوں طرح طرح کے کپڑوں اور چیزوں سے پُر تھے اور پھر لطف یہ کہ تمام چیزیں وہی جو ان کی خاص پسند کی تھیں۔

وحید متعجّب ہو کر بول اُٹھا، بھئی کمال کیا، یہ تمام سامان کر ڈالا اور میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں''۔

حمید نے کہا ''جی بھلا صاحب کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا مطلب؟''

وحید اس پر جھپٹ پڑا تو آج صبح سے بہت تیزیاں کر رہا ہے، سمجھ لیا ہے کہ میں آئی سی ایس کیا ہوں کہ بالکل موم کا بن گیا ہوں، کھڑا تو رہ!

وہ ہنستا ہوا یہ کہہ کر بھاگا ''اچھا مجھے پکڑ ہی لیجئے تو جانوں!''

دونوں بھائیوں میں دوڑ ہونے لگی، وہ بار بار جھکائیاں دے کر نکل جاتا مگر وحید برابر پیچھا کرتا

رہا، یہاں تک کہ حمید یہ سمجھ کر کہ اب گرفتار ہو جاؤں گا ایک املی کے درخت پر چڑھنے لگا۔ جب وحید اس کے نیچے آ کر رک گیا تو وہ بولا ''آیئے آئی سی۔ ایس صاحب یہاں تشریف لایئے''۔ وحید نے بھی جوتے کے فیتے کھول ڈالے، اور ننگے پاؤں ہو کر درخت پر چڑھنا شروع کیا، املی کا درخت بہت بڑا تھا۔ حمید تو پہلے سب سے اونچی شاخ پر چڑھ گیا، جب اس نے دیکھا کہ وحید اسی پر چلا آ رہا ہے تو جلدی سے وہ اُس سے اُچک کر دوسری پر ہو رہا۔ مگر تا بہ کے؟ وحید کی کمسنی کی مہارت کام آئی، اس نے بالآخر میاں حمید کو پکڑ ہی لیا، اور وہیں سے کان پکڑے نیچے اُتار لایا۔ حمید کے کھسیانے ہونے پر سارا گھر ہنستا رہا، گر بیگم خاموش بیٹھی رہیں، وحید نے ان کی خاموشی سے ذرا سا اثر لیا۔ اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو ریشمی قمیص کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی اور پتلون کی ساری ''کریز'' خاک میں مل گئی تھی۔ مگر اس وقت اس پر فضا اور ماحول کا پورا اثر ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ زیادہ پروانہ کی۔ سامنے بہت سے بانس کٹے ہوئے پڑے تھے۔ بھائی سے بولا ''یہ یہاں اچھے نہیں معلوم ہوتے، چلو دوسرے حصّے میں پھینک آئیں، دیکھیں تم کتنی محنت کر سکتے ہو؟''

بڑے میاں نے کہا ''نہیں بیٹا تم رہنے دو۔ کل مزدور بُلا کر ہٹا دیا جائے گا''۔

اُس نے ہنس کر کہا ''نہیں ابّا جان یہ اپنے کو بڑا قوی سمجھنے لگا ہے، آپ کے سامنے ہی آج فیصلہ ہو جائے گا!''

یہ کہہ کر حمید کے ساتھ بانسوں کے اٹھانے پر پل پڑا!

چشم زدن میں تقریباً سو بے چھلے بانس دونوں بھائیوں نے اُٹھا کر دوسرے حصّے میں منتقل کر دئے، دونوں پسینے میں شرابور، مٹّی سے اٹے ہوئے کرسیوں کے پاس آ کر تھک کر بیٹھ گئے۔

بڑی بی نے پوچھا ''حمید اب آئی سی۔ ایس کے متعلق کیا رائے ہے؟''

اس نے اپنے میلے ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ پوچھتے ہوئے کہا ''میری دانست میں ان سے

بجائے حکومت کرنے کے مزدوروں کا کام لینا چاہئے، یہ بڑے مضبوط معلوم ہوتے ہیں''۔
سب لوگ ہنس ہی رہے تھے کہ بیگم ساس سسرے کو سلام کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وحید کو بیگم کے جاتے ہی خیال آیا، اس نے اپنی دیہاتیت اور بربریت کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے اس کے بعد اس کی کوئی وقعت بیگم کی نظروں میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اسے حد درجہ خجالت و شرمندگی محسوس ہونے لگی اور باپ کے یہ کہنے پر ''کہ جاؤ میاں وحید تم نہا کر کپڑے بدل ڈالو۔ اب یہ تو بالکل درختوں اور بانسوں کی نذر ہو چکے ہیں''۔ اس کی کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

وہ گردن جھکائے اس حصّے میں گیا جو حمّام کرنے کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اس نے نہا دھو کر جلد جلد کپڑے بدل ڈالے، پھر وہ شرمندہ اور منفعل اس کمرے میں گیا جو بیگم کے لئے مخصوص تھا۔ دیکھا تو وہ اپنے کمرے میں اس کی خاص پسند کی ساری پہنے کھڑکی کے سامنے کھڑی ہیں، وحید کو ان کے انداز سے معلوم ہوا کہ بیگم اس کے افعال سے بیحد رنجیدہ ہیں، اس نے ڈرتے ڈرتے کہا ''بیگم!'' انہوں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ رُک رُک کر بولا ''بیگم! میں تم سے شرمندہ ہوں مگر۔۔۔ مگر میں کیا کروں۔۔۔ اس ماحول اور فضا نے۔۔۔۔ مجھے انسانیت کا جامہ اُتارنے پر مجبور کیا''۔

انہوں نے کہا ''انسانیت نہ کہئے آئی۔سی۔ایس کا جامہ کہئے''۔

وحید نے گھبرا کر ان کی صورت دیکھی، وہ بولیں میں آج تک یہی سمجھتی تھی کہ میں نے ایک آئی سی.ایس سے ایک مہذب، تعلیم یافتہ اور ایک شریف زادہ سے شادی کی ہے''۔

وحید بات کاٹ کر بولا ''مگر آج معلوم ہو گیا کہ تم نے ایک دیہاتی، گنوار اور جانور سے شادی کی ہے''؟

بیگم کی آنکھیں عجیب طرح کے نور سے چمکنے لگیں۔ وہ بولیں ''نہیں میں نے جو کچھ سمجھ رکھا تھا ان سب سے کہیں بہتر چیز سے شادی کی ہے یعنی۔۔ یعنی ایک مرد سے!''۔

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
کج روی	ٹیڑھا پن
ادّعا	دعویٰ کرنا
اعزّا	رشتہ دار اور عزیز ترین
دریدہ دہنی	منھ پھٹ ہونا، بیہودہ
سریع	جلدی کرنے ولا
چشم زدن	پلک جھپکنا
زود فہمی	بات کو جلد سمجھنا
دفعتہً	اچانک، یکا یک
خجالت	شرمندگی
ذکاوت	عقل مندی
ملمّع	چمکایا گیا
منفعل	شرمندہ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات

۱۔ وحید کے گاؤں کا نام کیا تھا؟

۲۔ وحید کے چھوٹے بھائی کا نام کیا تھا؟

۳۔ وحید کی بیگم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی تھی؟

مختصر سوالات

۴۔ وحید کی بیگم نے اپنے سسرال والوں کے ساتھ کیسے نباہ کیا؟

۵ وحید کی بچپن کی زندگی پر روشنی ڈالیے۔

۶۔ جہاں آرا بیگم کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

تفصیلی سوالات

۷۔ وحید کے کردار پر اظہارِ خیال کیجیے۔

۸۔ افسانہ 'آئی۔سی۔ایس۔' کا خلاصہ لکھیے۔

کرشن چندر

کرشن چندر۱۹۱۴ء میں غیر منقسم پنجاب کے وزیرآباد میں پیدا ہوئے۔انھوں نے ابتدائی تعلیم کشمیر میں حاصل کی۔پھر لاہور سے ایم۔اے۔اور ایل ایل۔بی۔کی تعلیم حاصل کی۔وہ کچھ عرصے تک وکالت اور درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔بعد میں آل انڈیا ریڈیو،دہلی میں بھی کچھ عرصے تک ملازمت کی۔ان کی عمر کا بڑا حصّہ ممبئی میں گزرا۔انھوں نے فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے۔ان کا انتقال ۱۹۷۷ء میں ممبئی میں ہی ہوا۔

کرشن چندر نے افسانوں اور ناولوں کے علاوہ ڈرامے،ریپوتاژ اور طنزیہ مضامین بھی لکھے لیکن انھوں نے پریم چند کے بعد افسانہ نگاری میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔کشمیر کی شادابی، فطرت کا حسن اور مظلوم اور پس ماندہ طبقات کی زندگی کے مسائل ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں حقیقت اور رومانیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کے افسانوں کے مجموعوں میں 'طلسمِ خیال'، 'ان داتا'، 'میں انتظار کروں گا'، 'ٹوٹے ہوئے تارے'، 'اجنتا سے آگے'، 'زندگی کے موڑ پر'، 'سمندر دور ہے'، 'نظارے'، 'ہم وحشی ہیں' بہت مشہور ہوئے۔ان کے ناول 'الٹا درخت'، 'جب کھیت جاگے'، 'شکست'، 'میری یادوں کی چنار'، 'ایک گدھے کی سرگزشت'، 'باون پتے'، 'دادر پل کے بچّے' اور 'ایک عورت ہزار دیوانے' زیادہ مقبول ہوئے۔ان کا ڈرامہ 'دروازہ کھول دو' بہت مشہور ہوا۔اس کے علاوہ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'دروازہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ان کی مشہور رپورتاژ 'پودے' 'صبح ہوتی ہے' اور 'لاہور سے بہرام گلہ تک' ہیں۔اس کے

علاوہ 'ہوائی قلعے' کے نام سے انھوں نے طنزیہ مضامین کا مجموعہ بھی لکھا۔

اس افسانہ کا مرکزی کردار گوردیال سنگھ ہے جو اپنے والد کے انتقال کے بعد گاؤں کی کھیتی باڑی چھوڑ کر ٹرک چلانے کے لیے ممبئی چلا جاتا ہے۔ ایمان داری اور بھولے پن کی وجہ سے اس کا میونسپلٹی کا ٹنڈر نامنظور ہو جاتا ہے اور بعد میں بھی جب ایمان داری سے کام کرنے پر اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو وہ ایمان داری کی راہ چھوڑ کر غیر قانونی طور سے اپنے ٹرک میں اورلوڈنگ کرنے لگ جاتا ہے۔ اس طرح اس افسانہ میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح رشوت خوری اور بے ایمانی کی وجہ سے ایک ایمان دار شخص بے ایمانی کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔

کرشن چندر

بھولا

پہلی بار جب میں نے گوردیال سنگھ کو دیکھا تو اس کا سارا منہ سوجھا ہوا تھا اور اس نے ڈھیلی پگڑی کے شملے سے اپنے منہ کو چھپا رکھا تھا اور شملے کے اوپر گھنی بھوؤ کے نیچے اس کی بڑی بڑی حیران آنکھیں درد سے کراہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ڈاڑھ کا درد ہے؟ میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کا منہ کھول کر دیکھا، داڑھ اپنی جگہ سے ہل چکی تھی اور داڑھ کے ارد گرد سیاہ خون جم گیا تھا، اور مسوڑھے بھی سوجھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی اناڑی نے داڑھ کو کھینچ کر نکالنے کی کوشش کی ہے۔

مجھ سے پہلے کس دندان ساز کے پاس گئے تھے؟''

میں نے گوردیاں سنگھ سے پوچھا۔

گوردیال بولا ''سٹیشن کے باہر فٹ پاتھ پر ایک دانت والا بیٹھتا ہے۔ وہ منتر پھونک کر دانت نکالتا ہے۔ بولتا تھا میرے منتر سے داڑھ میں ذرا بھی درد نہیں ہوگا اور داڑھ ایک ہی جھٹکے میں نکل آئے گا اور صرف آٹھ آنے لوں گا۔''

''پھر''؟

گوردیال جواب میں درد سے بلبلایا۔ اتنے لمبے چوڑے چھ فٹ کے جوان کا درد سے بلبلانا عجب مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا مگر دانت کا درد ہے ایسی بری چیز۔ محبت کا درد اور دانت کا درد دونوں بری بلا ہیں۔ مگر کسی شخص کو بیک وقت محبت کا درد اور دانت کا درد لاحق ہو جائے تو وہ سب سے پہلے اپنے دندان ساز کے پاس جائے گا۔ بعد میں اپنی محبوبہ کے ہاں جائے گا۔ اگر دانت کا درد محبت کے درد سے سوا نہ ہوتا

تو میں نے آج دندان سازی کا پیشہ چھوڑ کر عشق سازی کا مطب کھول لیا ہوتا جہاں لوگ اپنے دل کا درد لے کر آتے اور اپنی عقل کی ڈاڑھیں نکلوا کے چلے جاتے۔

گوردیال نے درد کی شدت سے اپنی دونوں آنکھیں اس زور سے بند کر لیں۔ جیسے درد اس کے دانت میں نہیں آنکھ میں ہوتا ہو۔ اس نے لچکتے ہوئے کہا، ''پہلے تو جی اس نے ایک کالا دھاگا لے کر اس پر ایک منتر پڑھا، پھر اس نے آٹھ آنے مجھ سے لے کر اپنی جیب میں ڈالے، پھر اس نے وہ کالا دھاگا لے کر میری داڑھ کے سوراخ کو جو جھٹکا دیا ہے تو مجھے عرش کے تارے نظر آ گئے۔'' گوردیال کا سارا جسم اس تکلیف دہ لمحہ کی یاد سے لرز گیا۔

سب سے پہلے تو میں نے اُسے دانت کا درد دُور کرنے کی دوا کھلائی۔ چند منٹ گزر جانے کے بعد جب اس کا درد غائب ہو گیا تو وہ کھسیانے طریقے سے کچھ مسکرا کے کچھ خفا ہوا کے بولا

اب مجھے کیا معلوم تھا ڈاکٹر صاحب! وہ آدمی پیسے لے کر بے ایمانی کرے گا۔ پیسے لے کر تو آدمی کام کرتا ہے، بے ایمانی نہیں کرتا ہے۔

''بمبئی میں کب سے ہو میں نے اس سے پوچھا''

گوردیال نے انگلیوں پر گن کر کہا۔ آج پورے پندرہ دن ہو گئے۔

''کیا کام کرتے ہو؟''

''کام۔ گوردیال اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔

میں ادھر پٹی خورد ضلع لدھیانہ میں کھیتی باڑی کرتا تھا اور باپ میرا ٹرک چلاتا تھا۔ مگر دو ماہ ہوئے میرا باپ مر گیا تو کھیتی باڑی اپنے چھوٹے بھائی کو سونپ کر باپ کا ٹرک لے کر بمبئی آ گیا۔ سنا تھا یہاں بمبئی میں بہت کام ملتا ہے۔

''پھر ملا''؟

''میونسپلٹی میں ٹنڈر بھر دیا ہے۔ پتھر ڈھونے کا۔ اب ٹنڈر پاس ہو جائے تو کچھ پتہ چلے۔ ابھی تو میرے پاس کوئی گراج بھی نہیں ہے اور رہنے کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔ اِدھر آپ کی بغل والی روڈ پر سردار بنتا سنگھ فلوٹ ماسٹر جور ہتے ہیں وہ ہمارے لدھیانے کے ہیں۔ میں نے ان کے گھر کے باہر سڑک پر ٹرک کھڑا کر دیا ہے اور رات کو وہیں جا کر ٹرک میں سو جاتا ہوں دن بھر میونسپلٹی کے دفتر کے چکر کاٹتا ہوں مگر ابھی ٹنڈر پاس نہیں ہوا۔ واہے گُورو کی کرپا ہوگی تو ہو جائے گی۔

نیچے کی منزل میں میرا گراج خالی تھا۔ کیوں کہ میرے پاس کوئی موٹر گاڑی نہ تھی۔ جب میں تقسیم کے بعد بمبئی آیا تو پارسی مالکن نے مجھے اوپر کی منزل میں سے دو کمرے دیدیے اور نیچے ایک گیراج۔ مگر گراج خالی ہی تھا۔ لاہور سے اکھڑنے کے بعد حالات کبھی اتنے نہ سدھر سکے کہ گاڑی لے سکوں۔ اس لیے سوچا کہ کیوں نہ گراج کرائے پر دے دوں؟

میں نے گوردیال سنگھ سے کہا۔ گراج تو میرے پاس ایک ہے اور خالی بھی ہے۔

''کیا کرایہ ہوگا''؟

''ساٹھ روپے ہوگا!''

ساٹھ روپے یقیناً زیادہ کرایہ تھا۔ مگر میں نے سوچا ساٹھ کہوں گا تو کہیں تیس چالیس میں فیصلہ ہوگا۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب گوردیال سنگھ نے کسی طرح کا بھاؤ تاؤ نہ کیا۔ اس نے فی الفور جیب سے ساٹھ روپے نکال کر مجھے دیدیے اور بولا۔ میں آج شام کو ٹرک لے کر آ جاؤں گا اور اگر آپ اجازت دیں تو خود بھی اس گراج میں رہ لوں گا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے گوردیال سے کہا۔

جب گوردیال سنگھ چلا گیا تو میں نے مڑ کر کمپونڈر سے کہا۔ ''یہ بیچارہ گوردیال سنگھ بھی کتنا بھولا ہے۔ اسے زندگی کا کچھ پتہ ہی نہیں!''

اس واقعہ کے چھ سات روز بعد گوردیال میرے پاس مٹھائی لے کر آیا اور کہنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب میرا ٹنڈر پاس ہو گیا ہے۔آپ کے گھر آنا تو مجھے بہت بھلا جی!

بھلا جی؟ میں نے گوردیال سے استفسار کرتے ہوئے کہا۔

''کیسے یہ تمہارا ٹنڈر منظور ہو گیا۔میونسپلٹی میں تمہاری کوئی جان پہچان ہو گی؟''

نہیں ڈاکٹر صاحب۔اپنی تو کوئی شناخت نہ تھی مگر میونسپلٹی والوں نے بتایا کہ میرا ٹنڈر سب سے کم پیسوں کا تھا۔اس لیے مجھے مل گیا جی اور میں نے بھی ڈاکٹر صاحب سوچ سمجھ کر بھرا تھا۔آنے جانے کے پٹرول کا خرچہ لگا لیا،کلیز کی تنخواہ اور اپنا خرچہ اور تھوڑے سے مرمت کے پیسے اور مجھے کیا چاہیے ڈاکٹر صاحب!باقی اپنے ہاتھ کی محنت ہے۔جتنی محنت کروں گا اتنے پیسے لے لوں گا۔

اس نے لڈّو توڑ کر میرے منہ میں ڈال دیا۔میں نے خوش ہو کر کہا۔مبارک ہو گوردیال سنگھ۔

گوردیال سنگھ خوش ہو کر بولا۔واہے گورو کی کرپا سے میں کل سے پتھر کی کان سے پتھر ڈھونا شروع کر دوں گا۔

یہ کہہ کر وہ کچھ یاد کر کے زور سے ہنسا۔

''میں نے پوچھا کیا بات ہے گوردیال؟''

وہ بولا۔''جب میرا ٹنڈر پاس ہو گیا تو انجنیر نے مجھے بدھائی دی اور بولا۔گوردیال میں تم کو اپنا آدمی دیتا ہوں وہ تم کو کواری دکھا دے گا۔''

میں نے ہنس کر کہا کیسی کواری؟انجنیر صاحب۔میں تو یہاں پتھر ڈھونے آیا ہوں شادی کرنے نہیں آیا۔ہمارے پنجاب میں''گوردیال نے تشریح کرتے ہوئے کہا''کواری تو اس لڑکی کو کہتے ہیں جس کی شادی نہیں ہوئی ہو۔اب مجھے کیا معلوم تھا۔گوردیال نے ہنس کر اپنے سپید اور بے حد متناسب دانت دکھاتے ہوئے کہا۔بمبئی میں کواری لڑکی کو نہیں کہتے۔پتھر کی کان کو کہتے ہیں!کواری؟بلّے.....بلے''؟

گوردیال زور سے ہنسا۔ پھر اپنی ڈھیلی پگڑی اپنے سر پر ٹھیک کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اپنے کمپونڈر سے کہا۔

یہ ہمارا گوردیال بھی کتنا بھولا ہے۔ اسے زندگی کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ اسی دن سہ پہر میں ایک مریض کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا اور لکڑی کا زینہ اتر کے نیچے گراج کے سامنے سے گزرنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گوردیال کا ٹرک گراج سے باہر کھڑا ہے اور گوردیال اپنی پگڑی اتارے ہوئے ایک میلی قمیص کے نیچے ایک میلا کچھ پہنے ہوئے جس کا ازار بند گھٹنوں تک لٹک رہا ہے ایک لوہے کے ڈرام کو اپنے سامنے رکھے ہوئے اپنے ٹرک کو پانی سے صاف کر رہا ہے۔

''کواری نہیں گئے؟''

گوردیال نے میری طرف مڑ کر دیکھا پھر اس نے ٹرک صاف کرنے والا میلا چیتھڑا لوہے کے ڈرام میں زور سے پھینک کر کہا، ''گیا تھا''

''پھر کیا ہوا؟''

''ٹنڈرنا منجور ہو گیا''

''وہ کیسے؟''

گوردیاں نے جلدی سے اپنا ازار بند کچھے میں اڑس لیا، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا، میں کواری میں گیا۔ وہاں سے پتھر لاد کر ٹرک بھر لیا اور جہاں پر سڑک کی مرمت ہو رہی تھی وہاں پر جا کر ٹرک خالی کر دیا اور سیر سے پرچہ لیا اور پرچہ لے کر انجنیئر کے پاس میونسپلٹی کے دفتر پہنچا۔ انجنیئر نے میرے ہاتھ میں ایک رسید دے کر کہا۔ یہ دس پھیروں کی رسید ہے۔ یہ رسید لے کر اکاؤنٹنٹ کے پاس جاؤ اور اس سے دس پھیروں کے پیسے لے لو۔ میں نے کہا مگر میں نے دس پھیرے نہیں لگائے۔ ابھی ایک ہی پھیرا لگایا ہے۔ انجنیئر صاحب آپ کو گلتی ہو رہی ہے۔

وہ بولا۔وہ سب ٹھیک ہے دس پھیروں کی رسید میں پانچ پھیروں کے پیسے میرے ہیں، پانچ تمھارے سمجھ گئے؟

میں سمجھ گیا مگر سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھا۔میں نے رسید اس کے منہ پر دے ماری اور بولا۔

اب ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے، انجنیر صاحب۔اب یہ بے ایمانی نہیں چلے گی۔اب نہ میں حرام کا پیسہ خود کھاؤں گا نہ تم کو کھانے دوں گا۔وہ بولا، تو جاؤ گھر جا کر بیٹھو۔تمہارا ٹنڈ رنا منجور۔''

گوردیال سنگھ نے میری طرف پیٹھ کر لی اور لوہے کے ڈرام سے گیلا چیتھڑا نکال کر زور زور سے اسے اپنے ٹرک پر رگڑنے لگا۔تھوڑی دیر تک تو میں چپ رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''اب تم کیا کرو گے گوردیال؟''

گوردیال بجلی کی سی تیزی سے میری طرف مڑا۔اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔وہ اپنے بازوؤں کو نچاتے ہوئے بولا۔مین جوان ہوں، محنت کر سکتا ہوں۔میرا ٹرک عمدہ ہے۔مجھے کہیں نہ کہیں ایمان داری کا کام مل جائے گا۔مگر یہ بے ایمانی مجھ سے نہ ہوگی۔ڈاکٹر صاحب! میں حرام کا پیسہ نہیں کھاؤں گا۔''

میں نے آہستہ سے سر جھکا لیا اور چپ چاپ اپنا مریض دیکھنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔

چار پانچ روز کے بعد گوردیال سنگھ پھر میرے پاس آیا۔اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور وہ اوپر میرے مطب میں آ کر سب کو مٹھائی بانٹنے لگا۔آج اس کے ساتھ اس کا کلیز بچتر سنگھ بھی تھا۔بچتر سنگھ بھی گوردیال سنگھ کی طرح چھ فٹ کا اونچا جوان تھا۔مگر عمر میں گوردیال سنگھ سے کم۔گول گول آنکھیں، شرارت سے چمکتی ہوئی۔اس نے اپنی داڑھی کس کے باندھ رکھی تھی۔اور اس کی پگڑی بھی کسی ہوئی تھی اور دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

میں نے پیڑا کھاتے ہوئے گوردیال سے پوچھا۔

''کام مل گیا؟''

واہے گرو کی کرپا سے بڑا اچھا کام ملا ہے۔ پریمر کمپنی جو لوہے کے کباڑ کا کام کرتی ہے، اس کا ٹوٹا پھوٹا لوہا احمد آباد سے یہاں لانا ہوگا اور یہاں سے روی بھر کے احمد آباد لے جاؤں گا۔ میرا دوٹن کا ٹرک ہے۔ دونوں طرف سے اچھی کمائی ہو جائے گی۔

اس واقعہ کے چار پانچ روز بعد تک نہ میں نے گوردیاں کو دیکھا نہ اس کے ٹرک کو۔ میں نے سمجھا، دونوں احمد آباد کے پھیروں میں مصروف ہوں گے۔ چار روز کے بعد مجھے گوردیال اور اس کا ٹرک اور اس کا کلینر بچتر سنگھ گراج کے باہر نظر آئے۔ مگر کچھ بجھے سے، کچھ پریشان سے۔ کسی گہری سوچ میں غلطاں، دونوں ٹرک کے باہر مڈگارڈ پر، بیٹھے ہوئے ایک میلی سی کاپی پر اپنا حساب جوڑ رہے تھے۔

کمائی کا حساب کر رہے ہیں؟ میں نے خوش ہو کر کہا۔ گوردیال نے کمائی کرنے والوں کو ایک موٹی سی گالی دی۔ میں دو قدم حیرت سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ پہلی بار تھی جب میں نے گوردیال کے منہ سے گالی سُنی اُسے سن کر ہی چوکنا ہو گیا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ میرے پوچھنے پر گوردیال نے بتایا۔

میرا ٹرک دوٹن کا ہے لیکن آپ جانتے ہیں اور لوڈ کرنا قانون کے خلاف ہے۔ میں نے یہ سوچ کر ٹرک میں پونے دوٹن ردّی بھری اور اسے لے کر احمد آباد روانہ ہو گیا۔ راستے میں سورت کا ناکہ آتا ہے اور دوسرے ناکے بھی آتے ہیں۔ جہاں مال اور اس کا وزن چیک کیا جاتا ہے۔ پہلے ناکے پر چیک کرنے والے بابو نے میرا لیسنس دیکھا، گاڑی کا نمبر دیکھا دوسرے کاغذ دیکھے۔ وزن دیکھا۔ ٹرک میں لدا ہوا سامان دیکھا۔ جب سب دیکھ چکا تو بولا ''سات روپے نکالو'' میں نے کہا کس بات کے روپے۔ وہ بابو میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر اس بابو کے ساتھ جو آدمی تھا، وہ مجھے پرے لے جا کر بولا۔ ''شاید پہلی بار آئے ہو، تم کو معلوم نہیں ہے کہ یہاں ہر ناکے پر ریٹ بندھا ہوا ہے۔ کسی ناکے کا سات روپے ہے۔ کسی کا دس روپے ہے۔ سب جگہ دینا پڑتا ہے۔ سب لوگ دیتے ہیں۔

میں نے کہا مگر یہ تو رشوت ہے۔

وہ بولا۔ یہ رشوت نہیں ہے۔ ناکے کا بھتّہ ہے۔

میں نے کہا، میں نے اور لوڈ کیا ہو۔ میرا لائسنس غلط ہو، کوئی کاغذ ٹھیک نہ ہو۔ سامان میں دارو لے کر جا رہا ہوں تو سات روپے دوں۔ جب ایمان داری سے لے کر جا رہا ہوں تو سات روپے کیوں دوں؟

میں نے سات روپے نہیں دیئے۔ بابو نے پھر میرے کاغذ دیکھے اور ان میں کوئی نقص نکال کر میری ٹرک کو آگے جانے سے روک دیا۔ دو گھنٹے میں سڑک کے کنارے ٹرک کھڑا کر کے بابو کی خوشامد کرتا رہا۔ مگر جب وہ کسی طرح نہیں مانا تو میں نے سات روپے اس کو دیئے۔ پھر اگلے ناکے پر بھی دیئے اور اس سے اگلے ناکے پر بھی بندھا بھتّہ دیا۔ اسی طرح احمد آباد سے واپسی پر تینوں چاروں جگہ بھتّہ دیا۔ اب جا کے واپس پہنچا ہوں اور اب میں بچتر سنگھ حساب کرتے ہیں تو ہم کو فائدے کے بجائے اس دھندے میں بھی نقصان نظر آتا ہے۔ ٹرک میں دو ٹن بھر کے لے جائیں تو نقصان ہی نقصان ہے۔ بچتر سنگھ بولتا ہے تین ٹن بھر کے لے جاؤ، سب کو بھتّہ دو اور کماؤ۔ مگر میں بولتا ہوں یہ تو کُھلی بے ایمانی ہے..... ہے کہ نہیں، ڈاکٹر صاحب! گوردیال سنگھ حیران پریشان اپنی میلی کاپی لیے میرے سامنے کھڑا تھا، اس کی میلی کاپی کا کھلا ورق زندگی کی کتاب کی طرح اپنے ماحول میں لرز رہا تھا اور اس کے داڑھی کے بال الجھے الجھے تھے اور اس کی حیران آنکھوں کی نگاہیں الجھی الجھی تھیں اور پھر وہ بالکل مجبور اور بے بس آواز میں مجھ سے کہنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب میں اپنے ہاتھوں سے اور کھری کمائی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے اس دیس میں کوئی ایسا کام نہیں ملے گا۔

میں بھلا اسے کیا جواب دیتا خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

اب گوردیال سنگھ کا کام چل نکلا تھا، اب میں اسے یا اس کے ٹرک کو بہت کم گراج میں دیکھتا اور جب کبھی گوردیال سنگھ مجھے نظر آتا تو بے حد خوش اور شگفتہ مزاج دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے کی بوسکی کی قمیض اور ریشمی تہمد پہنے ہوئے ملتا۔ سر پر عمدہ کسی ہوئی کشتی نما پگڑی ہوتی اور اس کا کلیز بھی اچھے صاف ستھرے کپڑوں میں ہوتا۔ ایک بار ہمسایوں نے مجھ سے شکایت بھی کی کہ کل رات کو گوردیال سنگھ اور بچتر سنگھ نے شراب پی کر سڑک پر دنگا کیا مگر مجھے ان کی بات کا یقین نہ آیا۔ پھر بھی میں نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے دوسرے دن علی الصباح گوردیال سے پوچھنا چاہا مگر جب میں اوپر کی منزل سے نیچے لکڑی کے زینے سے اتر کر گراج کے باہر پہنچا تو گوردیال اپنا ٹرک لے کر جا چکا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

چند ہفتوں کے بعد مجھے بنتا سنگھ فلوٹ ماسٹر نے بتایا کہ احمد آباد سے واپس آتے ہوئے بمبئی کے قریب گوردیال نے رانگ سائڈ پر ٹرک چلاتے ہوئے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا۔ ڈاکٹری معائنہ پر گوردیال شراب میں دھت پایا گیا۔

سُنا ہے! کل عدالت میں اُسے دو ماہ کی جیل بھی ہوگئی ہے۔ بنتا سنگھ دوا کی پڑیا جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

مگر دوسرے ہی دن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے گوردیال سنگھ کو لکڑیوں کے شکستہ زینے پر کھٹ کھٹ کرتے چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبّہ تھا اور مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے سیڑھیاں چلتا چلا آ رہا تھا۔

میں نے چلاّ کر کہا۔ ارے گوردیال تمھیں تو جیل ہوگئی تھی؟

''ہاں جیل تو ہوگئی ہے ڈاکٹر صاحب۔، دو مہینے کی ہوئی ہے۔''

''مگر تم تو یہاں موجود ہو؟''

ہاں وہ مسکرا کر بولا ''میں نے اپنی جگہ بچتر سنگھ کو جیل بھیج دیا''

اپنی جگہ بچتر سنگھ کو؟ حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟... یہ... کیسے ممکن ہے؟''

''بہت آسان ہے، گوردیال سنگھ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنی جگہ مقدمہ میں بچتر سنگھ کو کھڑا کر دیا تھا۔ جب وکیل نے اس سے پوچھا، تمھارا نام، تو وہ بولا گوردیال سنگھ، باپ کا نام گوربخش سنگھ۔ کہاں کے رہنے والے ہو۔ پٹی خورد، ضلع لدھیانہ۔ یہ ایکسڈنٹ تم نے کیا۔ جی ہاں! تم رانگ سائڈ پر تھے؟ جی ہاں! تم اقبال جرم کرتے ہو؟ جی ہاں!

عدالت نے اس کو دو ماہ کی سجا دے دی۔ وہ اب جیل میں ہے میری جگہ اور میں جیل کے باہر ہوں۔ وہ دو مہینے وہاں رہے گا اور میں یہاں باہر رہ کر ٹرک چلاؤں گا اور اپنا اور اس کے بال بچوں کا پیٹ پالوں گا۔ دھندا تو چالو ہی رہنا چاہیے ڈاکٹر جی۔ اور یہ احمد آباد والے کام میں بہت فائدہ ہے۔ اب میں دو ٹن کے بجائے تین ٹن مال ٹرک میں بھر کے لے جاتا ہوں۔ اور آتے جاتے دونوں طرف کے ناکے کا بھتّہ کٹا کر بھی بہت فائدہ میں رہتا ہوں۔ ایمان داری اس دیس میں گناہ ہے ڈاکٹر صاحب۔ میں ایمان دار رہتا تو آج بھوکا مرتا۔ ابھی بچتر سنگھ کی بیوی رو رہی تھی۔ بول رہی تھی کہ میں سب جا کے عدالت میں کہہ دوں گی، میں نے اُسے دو سو روپے دیئے تو چپ ہوگئی۔ آخر وہ بھی کیا کرے۔ بال بچوں کا پیٹ تو اُسے بھی بھرنا ہے اور اگر بچتر سنگھ میری جگہ جیل نہ جاتا تو آج یہ ٹرک چلا کے کمائی کون کرتا کیوں؟

مگر مجھے کسی طرح یقین نہ آ رہا تھا۔ مگر گوردیال سنگھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا۔ تم یہاں۔ تمھاری جگہ کوئی دوسرا آدمی جیل میں؟... یہ کیسے... ہوسکتا ہے؟

گوردیال سنگھ ہنسا۔ اس نے ڈبہ سے ایک پیڑا نکال کر میرے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

آپ بھی کتنے بھولے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ آپ کو زندگی کا کچھ پتہ ہی نہیں۔

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معنی
شملہ (شملے)	عمامہ کا سرا یا چوٹی
اثبات	دلیل، ثبوت، تصدیق
دندان ساز	مصنوعی دانت بنانے والا
مضحکہ خیز	ہنسی مذاق میں ڈالنے والی بات
لاحق ہونا	وابستہ ہونا، کوئی بیماری لگنا
مطب	وہ جگہ جہاں طبیب مریضوں کا علاج کرتا ہے
فی الفور	جلدی، فوراً، شتابی
اِستفسار	دریافت کرنا، پوچھنا
کلیز	لاری کے ڈرائیور کا مددگار
متناسب	باہم نسبت رکھنے والا
سہ پہر	تیسرا پہر، ایک دن میں آٹھ پہر ہوتے ہیں
غلطاں	الجھا ہوا، اُدھیڑ بُن میں، پریشان
شگفتہ	کھلا ہوا، خوش

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات

۱۔ گوردیال سنگھ کہاں کا رہنے والا تھا؟

۲۔ گوردیال سنگھ کے والد کیا کام کرتے تھے؟

۳۔ گوردیال سنگھ کے کلیز کا کیا نام تھا؟

مختصر سوالات

۴۔ گوردیال سنگھ کا میونسپلٹی کا ٹنڈر کیوں نامنظور ہو جاتا ہے؟

۵۔ ڈاکٹر صاحب کی گوردیال سنگھ کے بارے میں رائے کس طرح سے بدلتی رہتی ہے؟

۶۔ اس افسانہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھیے کہ ملک میں پھیلی ہوئی رشوت خوری پر کس طرح روک لگائی جاسکتی ہے؟

تفصیلی سوالات

۷۔ گوردیال سنگھ کے کردار پر اظہارِ خیال کیجیے۔

۸۔ افسانہ 'بھولا' کا خلاصہ لکھیے۔

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی ۱۸۹۲ء میں مڑیا ہو ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔انہوں نے جون پور میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔فارسی میں ایم۔اے۔کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہی اردو کے لکچرر ہو گئے اور بعد میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پہلے صدر بنائے گئے۔۱۹۷۷ء میں علی گڑھ میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔

پروفیسر احتشام حسین نے رشید احمد صدیقی کو اس دور کا سب سے بڑا مزاح نگار مانا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑے طنز نگار اور انشا پرداز بھی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے کئی مشہور و معروف شخصیات پر خاکے بھی لکھے ہیں۔وہ بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کے مضامین میں سنجیدگی ،تفکّر اور خوش طبعی کے عناصر موجود ہیں۔رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'مضامین رشید' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ 'گنج ہائے گراں مایہ' ہے اور ان کی خودنوشت 'آشفتہ بیانی میری' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ان کی ریڈیو پر نشر ہوئی تقاریر کا مجموعہ 'خنداں' کے نام سے چھپ چکا ہے۔اس کے علاوہ ان کے اہم مضامین 'ہم نفسانِ رفتہ' اور 'شیخ نیازی' ہیں۔

حکومتِ ہند نے انہیں ۱۹۶۳ء میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔'غالبؔ کی شخصیت اور شاعری' کتاب پر ساہتیہ اکادمی کی جانب سے بھی انہیں ایوارڈ دیا گیا۔

'دربان' رشید احمد صدیقی کا ایک طنزیہ مضمون ہے جس میں ہمارے معاشرے میں دربانوں کے

رتبہ کوطنز ومزاح کی چاشنی میں ڈبو کر پیش کیا گیا ہے۔ وہ دلچسپ انداز میں دربانوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں اور خود کی دربانوں سے سابقہ پڑنے کی آپ بیتی بھی بیان کرتے ہیں۔ان کے مطابق غالبؔ کو بھی اپنی زندگی میں دربانوں سے ایسے ہی تجربے ہوئے ہوں گے۔ وہ مثال کے طور پر غالبؔ کے کچھ اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔اس مضمون میں دربانوں میں نوکر، چاکر، چوکیدار سبھی کو شامل کیا گیا ہے اور ان کی عادات واطوار اور قسمیں بھی بتائی گئیں ہیں۔مصنف نے آج کے دور میں دربانوں کی اصل قوم کو ناپید بتایا ہے۔ان کے مطابق جہاں دربان تاجر کی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے وہیں انہوں نے دربانوں کی مالک کی حیثیت سے کام کرنے کی بدنیتی کو غلط بتایا ہے۔

رشید احمد صدیقی

دربان

غالب اردو فارسی کے زبردست شاعر گزرے ہیں، ایک جگہ فرمایا ہے: ع

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا

یعنی عشق جس کے دم سے زندگی کی کشتی زمانے کے دھارے پر بہتی اچھلتی جاتی ہے دربان کی جھڑکی گھڑکی سے سہم ہی گیا اور عاشقِ نامراد جس آرزو اور ارمان کے ساتھ محبوب کی بارگاہ تک پہنچا تھا وہ سارے کا سارا کافور ہو گیا۔ غالبؔ کا میں دل سے قدردان ہوں اور کوئی غالبؔ کو بُرا کہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ بشرطیکہ بُرا کہنے والا دربان نہ ہو، لیکن باوجود اس اعتقاد اور ارادت کے برابر اس پھیر میں رہا کہ غالبؔ یا ان کے ہیرو پر یہ واقعہ گذرا ہی کیوں؟ اتفاقاً ایک اور شعر نظر سے گذرا جس کے مفہوم پر غور کرنے کے بعد دربانوں کی زبان درازی یا دست درازی کو ایک حد تک حق بجانب سمجھنے لگا۔ شعر یہ ہے ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسے پھر گیا

جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اس شعر کو آپ جس طور پر چاہیں معنی کا جامہ پہنا لیں، لیکن میرا ذہن اس وقت کسی اور طرف منتقل ہو رہا ہے اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ نتیجہ اخذ کرنے میں عجلت کے بجائے ہمدردی سے کام لیں، شعر کے پرکھنے سمجھنے کی خواہ مخواہ نہیں کوشش کرتا کیونکہ میرے نزدیک سب سے اچھا شعر وہ ہے جو جلد سے جلد ہمیں متاثر کر دے، اس کے معنی ڈھونڈھنے میں اتنی کوشش نہ کرنی پڑے جتنی ایک فلسفی کو عقل کی بات کرنے یا کہنے میں پڑتی ہے۔

آپ ہی غور فرمائیں کہ اس شعر سے آپ کے سامنے کتنے اور کیسے کیسے مناظر پھر جاتے ہیں۔

شعرایک دفعہ پھرسن لیجیے ۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسے پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہو ا بستر کھلا

فرض کیجیے ایک شخص تھکا ہارا آتا ہے، مدّتوں سے نہ کھانا ملا ہے، اور نہ حجام، خط بڑھا ہوا، کمر جھکی ہوئی، کاندھے پر ایک میلا سا بستر، لباس پھٹا ہوا، نمناک اور بدبودار بھی، ہاتھ میں حقہ، بستر میں نگالی، ایک طرف ٹین کا زخم خوردہ لوٹا لٹکا ہوا، منہ میں دانت تھوڑے اور پائیریا بہت کچھ، شعر پڑھتے، بددعائیں دیتے کسی بھلے مانس کے دروازے پر پہنچے، اس نے ترس کھا کر ان سے کہد یا میاں کمر کھولو، کچھ کھاؤ پیو اور آرام کرلو، انھوں نے کمر کھولنے کے بجائے بستر کھول دیا، دری کا کہیں سے تانا غائب اور کہیں سے بانا ، کہیں سے دونوں چادر بشکلِ تہمد، اور تکیہ ایسا کہ سر رکھ کر سو یئے تو نیند سے پہلے کلورفام کا لطف آجائے اور اٹھیے تو سر اور گردن کے ساتھ تکیہ بھی اٹھ بیٹھے، صاحب خانہ یہ زہرِ عشق پھیلا دیکھ کر دربان کی طرف کچھ اس نظر سے دیکھا کہ اس نے بڑھ کر ایک ٹھوکر ماری، بستر اور لوٹا دونوں سڑک پر آرہے اور ان کی گردن میں ہاتھ دے کر چھٹکا دیا تو پگڑی شلوار بن گئی اور شلوار پگڑی، چنانچہ عاشق نامراد دربان کو دیکھتے جاتے تھے اور بسواری پیدل آگے بڑھتے جاتے تھے، اس دوران ایک شعر اور کھڑا کرلیا۔ فرمایا ۔

واں گیا بھٹی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں

غالبؔ کو اس قسم کے تجربے دربانوں کی ذات سے اکثر حاصل ہوئے تھے۔ ایک بار فقیر کے بھیس میں کوہِ جاناں کی طرف نکل گئے تھے، دربان سے سابقہ پڑا وہاں بھی ایک اجتہادی غلطی ہوگئی جس کا خمیازہ بُری طرح بھگتنا پڑا، فرماتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے کیے

یہ تو شعر و شاعری ہوئی، جہاں غالبؔ سے اتنا سروکار نہ تھا، ان دربانوں سے جن کا سابقہ ان عشاق سے پڑتا ہے جن کی دنیا میں کمی نہیں ہے لیکن دنیا میں نہ تو صرف عشاق ہی بستے ہیں اور ہر دربان کٹکھنا مرکھنا ہوتا ہے۔

ریڈیو نے دنیا کی طنابیں کھینچ دی ہیں جہاں تک آواز کا تعلق ہے ہمارے لیے دور اور نزدیک یکساں ہو گیا ہے اس لیے ہم کو ان دربانوں کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے جو زندگی کے ہر شعبے پر مسلّط ہیں۔

سب سے زیادہ عجیب قسم ان دربانوں کی ہوتی ہے جو نو وارد کو آنے دیتے ہیں جانے نہیں دیتے اور ان سے زیادہ عجیب میں خود ہوں، دربان کی حیثیت سے نہیں بلکہ وارد کی حیثیت سے۔ مجھ پر جب کوئی آفت آتی ہے تو عورتوں سے مشورہ کرتا ہوں اس لیے کہ مجھے اگر یہ خود اس آفت کا سبب نہیں ہیں تو مشورہ اچھا دیتی ہیں، اس سے آپ کو یہ یقین ہو گیا کہ میں عورتوں کے ناقص العقل ہونے کا قائل نہیں ہوں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ مشورہ پر اس وقت تک عمل نہیں کرتا جب تک میری عقلِ ناقص اس کے ٹھیک ہونے کی تصدیق نہیں کرتی، اگر عورتوں کے مشورے اور میری عقلِ ناقص میں تطابق نہ ہوا تو سفر پر نکل جاتا ہوں، اس لیے کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ سفر کامیابی کی کنجی ہے۔ ایک ایسے ہی موقع پر میں نے سفر کیا، راستے میں ایسے مقام پر کھڑا ہونا پڑا جس کے بارے میں سنتا آیا تھا کہ وہاں سے کوئی شخص ناکام نہیں پھرتا۔

سامنے ایک بڑا پھاٹک تھا جس میں کئی نفر دربار بیٹھے ہوئے تھے، ایک نے آتے دیکھ کر پکارا، دعا فقیراں۔ آرکیسٹرا نے جواب دیا، رحم اللہ، پھاٹک میں داخل ہوا تو پہلے نے پھر آواز دی، قدم درویشاں،

جواب آیا، جس میں معلوم نہیں کتنے مقامات سے ریلے ہوا تھا، ''ردّبلا'' مجھے ہاتھوں ہاتھ صحن تک پہنچایا گیا۔ جہاں دربانوں کی ایک دوسری ٹولی پذیرائی کے لیے موجود تھی، پہلی ٹولی نے کچھ آیتیں پڑھیں اور چار آنے پیسے طلب کیے، میں نے چار آنے حوالے کر دیئے اور وہیں سے پسپائی کا بھی ارادہ کر لیا۔ لیکن دوسری ٹولی نے راہِ فرار قطع کر دی۔ ایک جو ان میں سے بڑا ریلا تھا، گھڑک کر بولا۔ وضو بناؤ، مجھے یہ توہین گراں گذری، میں نے کہا آخر تم کو وضو بگڑنے کا گمان کیوں کر ہوا۔ اس نے کہا حلیہ بگڑا ہوا ہو تو وضو قائم کہاں رہتا ہے، میں نے سعادت مندی سے جس میں غصہ وغم کی نا قابلِ برداشت لہریں اٹھ رہی تھیں، وضو کیا، ٹولی کے جمعدار نے کہا وضو کرائی ایک آنہ لاؤ، غرض کہ وضو تو میں نے کیا، ایک آنہ تمہارا کیسا ہوا۔ اس نے کہا اس بارگاہ میں بکواس نہیں کرتے، نذرانے دیتے ہیں۔ میں نے ایک آنے سے ہاتھ دھویا، آگے بڑھے ایک صاحب نے ہاتھ پکڑا اور اس طور پر بغل گیر ہوئے گویا میرے سارے پیسے واپس کر دیں گے۔ لیکن اتفاق سے میرا ہاتھ جیب ہی میں رہ گیا تھا اور اتفاق ہی سے دوسرے بزرگ کا ہاتھ بھی اسی جیب میں پہنچا۔ چنانچہ ہم دونوں نے مصافحہ کر کے علیحدگی اختیار کر لی۔

یہ واقعہ کچھ ایسا نہ تھا کہ اس پر قانونی داؤ پیچ کے بجائے تصوف پر گفتگو ہونے لگتی، لیکن دوست نے فرمایا کہ بھائی عرفان وسلوک کا راستہ لگتی ہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ اس راستے پر چلنے والوں کو دنیاوی جاہ ومتاع سے ہی بے نیاز کر کے آگے بڑھاؤں۔ میں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے دنیاوی جاہ ومتاع ہی کو خطرہ میں پا کر یہاں کا رخ کیا تھا، اس لیے میرے مقصد کی نوعیت جداگانہ ہے، کہنے لگے، یہ مسئلہ بحث طلب ہے، اچھا تیار ہو جاؤ، سامنے دریچہ ہے اس میں منہ ڈال کر دعا مانگو۔ میں نے کہا میں دریچہ میں منہ ڈال کر دعا مانگوں گا، مجھے دعا مانگنی ہے مائیکروفون پر تقریر براڈ کاسٹ نہیں کرنی ہے۔ اس پر اس نے مجھے کچھ اس طور پر گھورا کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے کھڑکی میں منہ ڈال دیا اور خوش رہا۔ ساتھی نے کہا زور سے دعا مانگو۔ میں نے فریاد کی اے منبعِ فیض وسخا دعا کیجیے کہ آئندہ مجھے کسی ایسے مقام پر جانے

کی توفیق نہ ہو جہاں عاقبت دربانوں کے ہاتھ میں ہو۔ میری دعا بد دعا بن کر سامنے آئی، گردن کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ میرے لیے جو بے تکلفی روا رکھی گئی تھی اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے یقین ہے کہ گردن ہی نہیں سارا جسم ہی کھڑکی کے اندر ہوتا تو بھی نہایت آسانی سے باہر نکل آتا، انجام یہ ہوا کہ بقدر ایک روپیہ کے میرا وزن ہلکا ہو گیا، گرتا پڑتا صدر دروازہ پر آیا۔ یہاں دیکھتا ہوں کہ تانگا والا معہ اسباب کے غائب ہے۔ دربان پہلے ہی سے میرے کچھ دوست نہ تھے، ناچار پولیس کے سپاہی سے رجوع کرنا پڑا۔ اس نے کہا تانگے کا نمبر معلوم ہے، میں نے کہا اول تو میں نمبر دیکھا ہی نہ تھا اور دیکھا بھی ہوتا تو اس سلوک کے بعد مجھ سے روا رکھا گیا، یاد کس کو رہتا، اس نے دریافت کیا، کچھ حلیہ یاد ہے، میں نے کہا، ہاں شکل نہیں تو تیور کچھ انھیں بزرگوں سے ملتا جلتا تھا جو سامنے دروازے پر نظر آ رہے ہیں پولیس والے نے میرے ساتھ بڑی ہمدردی کی، یعنی مزید سوالات نہیں کیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

اصلی دربانوں کی قوم اب ناپید ہو چلی ہے لیکن ان کی یادگار اب بھی جہاں تہاں نظر آ جاتی ہے۔ اس قسم کے لوگ کچھ کلکتہ، بمبئی اور رنگون وغیرہ میں ملتے ہیں۔ ان مقامات پر طالب علمی کے زمانے میں ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، اول تو میرا طالب علمی کا زمانہ تھا، جب دل لگی ذمہ داری سے زیادہ دلکش معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ مجھے اپنی ہی نہیں دوسروں کی ذمہ داری بھی گراں گذرتی تھی، چنانچہ ایک سیٹھ صاحب کے ہاں جانا پڑا، جاتے ہی دربان سے مڈبھیڑ ہوئی پوچھا، سیٹھ صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس نے کہا، سیٹھ خلاص ہو گیا۔ مجھے سیٹھ صاحب کی اس صفت یا کمزوری سے بالکل واقفیت نہ تھی، لیکن دربان نے جس قطعیت اور لب ولہجہ کے ساتھ یہ بات کہی تھی اس سے تفریح ہوئی، میں نے خلاص ہو جانے کو سیٹھ صاحب کی کوئی طبی کمزوری سمجھا۔ چنانچہ دوسرے ساتھیوں کو آواز دی وہ بھی آ گئے، خدا جانے دربان نے کیا سمجھا۔ اس نے آواز دی، اس کے ساتھی بھی نکل آئے اور قریب تھا کہ فائر بریگیڈ وغیرہ قسم کی چیز آ جاتی کہ دوسرے لوگ بھی آ کر جمع ہو گئے۔ گفتگو پر معلوم ہوا کہ سیٹھ

صاحب کا دیوالہ نکل گیا تھا اور خلاص کا مفہوم یہی تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لفظ ان مقامات پر ہر مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جس کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔

کلکتہ بمبئی میں دربانوں کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے آنے کی اطلاع صاحب خانہ کو کریں اور روپے پیسے زنانہ سواری یا بچوں کو لانے لیجانے میں مدد دیں۔ان کا بڑا اعتبار کیا جاتا ہے۔تاجر کا ہر کام اعتبار پر ہوتا ہے۔وہ ساکھ کو اپنی سب سے بڑی متاع سمجھتا ہے۔اسی بنا پر اپنے دربان پر بھی بھروسہ کرتا ہے۔تاجر کی زندگی میں دربان اہم عنصر ہے۔ایک طرف وہ اپنے مالک کو ہر قسم کے خطرے سے بچانے کی فکر رکھتا ہے۔دوسری طرف اس کی جسمانی آسائش کی دیکھ بھال کرتا ہے۔اس کے بچوں کا اتالیق ہوتا ہے اور خاندان پر کوئی مصیبت پڑ جائے تو وہ اپنی معلومات ،اپنی ساکھ اور اپنے تجربات کو کام میں لاکر خاندان کو تباہی سے بچالیتا ہے۔اس کو مالی منفعت کم حاصل ہوتی ہے،لیکن ایک اچھے انسان کی مانند وہ فرائض کی انجام دہی کو اپنا سب سے بڑا انعام تصوّر کرتا ہے۔

دربانوں کے زمرہ میں نوکر، چاکر، چوکیدار سبھی آجاتے ہیں۔مجھے ایسے دربانوں کا بھی تجربہ ہے جو پہلے کبھی جرائم کے سلسلے میں سزا پا چکے تھے لیکن آقا اور ملازم کے رشتہ میں منسلک ہوکر ایسے وفادار ہوجاتے ہیں کہ مالک کی عزت وعافیت کی نگہداشت میں سخت کڑیاں جھیل جاتے ہیں۔ایک بار ایسے شخص سے گفتگو کی جو پہلے کبھی نہایت سنگین جرائم کا مرتکب ہو چکا تھا اور ایک بہت بڑے تاجر کا دربان تھا،اس نے کہا جرائم پر اب بھی قادر ہوں اور موقع ملے تو شاید اس سے گریز بھی نہ کروں ،لیکن جرائم پیشوں کی روایت یہ ہے کہ ہم جس سفاکی سے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں،اسی شدت کے ساتھ آقا کے جانثار بھی ہوتے ہیں۔اس میں مذہب یا اخلاق کا کوئی دخل نہیں صرف جذبات کی شدّت اور استواری ہے جس میں ہمارے ارادے یا سوسائٹی کے دباؤ آپ کی تعلیم وتلقین کا مطلق دخل نہیں۔

''دربانیت'' بعض دوسرے جذبوں کے ماتحت دنیا کی مصیبت اور ہلاکت کا بھی باعث ہے۔

زندگی کے جتنے راستے اب تک ہم پر کھلے ہیں۔ مثلاً اخلاق ، مذہب، سائنس ، سیاست، شعر و ادب، حکومت، قومیت، تجارت، لیڈری، بازی گری ان سب پر دربانوں کا عمل دخل ہے، لیکن یہ دربان بن کر دربان کی بدنامی کا باعث ہیں۔ ان میں ہر شخص دربان اس لیے بننا چاہتا ہے کہ اس کو دربان کی نہیں بلکہ مالک کی حیثیت دے دی جائے اور یہی وہ بدنیتی اور کم ظرفی ہے جس نے سوسائٹی کو گندا اور متعفّن کر دیا ہے جس کی تفصیل پیش کرنا یوں ممکن نہیں کہ ریڈیو والے گندی اور متعفّن چیزوں یا باتوں کو نشر نہیں کرنے دیتے دربان ہی جو ٹھہرے!

مشکل الفاظ اوران کے معنی

الفاظ	معنی
اعتقاد	عقیدہ، یقین، ایمان
دست درازی	مار پیٹ، زیادتی
اخذ	لے لینا، اختیار کرنا
عجلت	جلدی، شتابی
کمر کھولنا	آرام کرنا، دم لینا
سابقہ پڑنا	واسطہ پڑنا، جان پہچان ہونا
طنابیں کھینچنا	دوری یا فاصلے کو کم کرنا
ناقص العقل	کم عقل، بے وقوف
پذیرائی	قبولیّت، منظوری
پسپائی	پیچھے ہٹنا، ہار
قطع کرنا	چھوڑنا، کاٹنا، الگ کرنا
گراں گذرنا	ناگوار ہونا، بُرا لگنا
نوعیت	قسم، خصوصیّت
اوسان خطا ہو جانا	حواس بجا نہ رہنا
عاقبت	انجام، آخرت

ملحوظ	لحاظ کیا گیا، خیال کیا گیا
رجوع کرنا	کسی طرف متوجہ ہونا، مخاطب ہونا
ناپید ہونا	گُم ہونا، تباہ و برباد ہونا
قطعیت	وہ امر جس پر شک وشبہ نہ ہو
متاع	تجارت کا سامان، پونجی
آسائش	راحت، آرام
اتالیق	استاد، تربیت سکھانے والا
منفعت	مفید یا فائدہ مند
زُمرہ	گروہ، جماعت
عافیت	سلامتی، امن، بھلائی
مرتکب	قصوروار، مُجرم، کسی فعل کو کرنے والا
استواری	مضبوطی، پائیداری
مطلق	بالکل، قطعی
کم ظرفی	کم حوصلگی، اوچھا پن
متعفن	بدبودار، سڑا ہوا

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ دربانوں کے زمرہ میں کون کون شامل ہیں؟

۲۔ تاجر کی زندگی میں کس کو ایک اہم عنصر مانا گیا ہے؟

۳۔ کس مشہور اردو شاعر کے دربانوں سے سابقہ پڑنے کی بات کہی گئی ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ مصنف کا دربانوں سے سابقہ کس طرح پڑا؟

۵۔ ہر شخص دربان کیوں بننا چاہتا ہے؟

۶۔ دربانوں کا زندگی کے کس کس شعبے میں دخل ہے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ دربانوں کی عادات اور اقسام کا تفصیل سے ذکر کیجیے۔

۸۔ اس سبق کا خلاصہ بیان کیجیے۔